آصف فرّخی
سفر کے خوش نصیب

سفر کے خوش نصیب

(سفر انتظار حسین کے ساتھ)

آصف فرّخی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

910.4 Asif Farrukhi
Safar Kay Khush Naseeb/ Asif Farrukhi.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2014.
142pp.
1. Urdu Literature - Travelogue.
I. Title.

2014ء
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2730-5
ISBN-13: 978-969-35-2730-8

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

فہرست

سفر در سفر

آصف فرخی کے سفروں کی یہ روداد پڑھنے والے کے ذہن کو ایک ساتھ کئی راستوں پر لے جاتی ہے۔ ہمارے زمانے کے بیش تر لکھنے والوں نے نثر کی جن صنفوں کو سب سے زیادہ خراب کیا ہے، ان میں سفرنامہ بھی ہے۔ اپنے تجربوں کا سطحی بیان، یا پھر ڈھکے چھپے انداز میں اپنے آپ کو سجانے یا ایک مہم جو کے طور پر سامنے لانے کی کوشش۔ مگر یہ ایک اور طرح کی روداد ہے۔ آصف نے اس سے پہلے بھی مغربی دنیا سے اپنے براہِ راست رابطے کا ایک قصہ ترتیب دیا تھا جس میں تاریخ، معاشرت، رپورتاژ، سوانح، سرگزشت، ڈائری، یادداشت اور نامانوس منزلوں سے شناسائی کے تجربے نے ایک انوکھے بیانیے کی شکل اختیار کرلی تھی۔ جرمنی پر مرکوز اس بیانیے میں شاہد، مشہود اور مشاہدے کی تثلیث ایک ایسی تخلیقی وحدت کی تشکیل اور عکاسی کا ذریعہ بنی تھی جو رسمی اور روایتی سفرنامے کی روداد سے آگے کی چیز ہے۔ آصف نے دیارِ مغرب کے اجنبی مناظر کو ایک سیّاح کی آنکھ سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ، ان مناظر کی آنکھ سے خود اپنے آپ کو بھی دیکھا اور دکھایا تھا۔ اب کینیڈا اور انگلستان کے اس سفر کی تفصیل میں کچھ ایسے رنگ بھی شامل ہوگئے ہیں جو ایک کثیر جہتی عالمی ادبی منظرنامے کے رمزوں سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں۔ اس تجربے میں وہ انتظار حسین کے شریک ہیں جو اب کے بار بکر انٹرنیشنل انعام کے لیے شارٹ لسٹ لیے گئے تھے، مگر یہ کیسی ہم سفری ہے کہ ہر نئے موڑ کے ساتھ ایک کے لیے دوسرے کا بھید کچھ اور گہرا ہوتا جاتا ہے، اس کہانی میں انتظار حسین کی اوپر سے سادہ

اور بڑی حد تک کمی ہوئی شخصیت ایک پُر پیچ اور وسیع تناظر کے ساتھ رونما ہوئی ہے۔''آخری آدمی'' کی ایک کہانی (پرچھائیں) میں انتظار حسین نے لکھا تھا کہ''ہم سفر بہرصورت ایک بھید ہے۔ ہم سفر کا ایک دفعہ آکر پھر کبھی نظر نہ آنا بھی ایک بھید ہے اور ایک دفعہ نظر آکر دوبارہ نظر آنا بھی ایک بھید ہے____''

آصف کے زیرِ نظر سفر ناموں کو پڑھتے وقت بار بار ہم ایک بھید بھری کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں اور ان کے ادراک کی گرفت پر بار بار ہماری حیرت جاگتی ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ آصف نے اس روداد کو صرف اپنی یا انتظار حسین کی روداد کے بیان تک محدود نہیں رکھا ہے۔ ایک وسیع تر تناظر اور متعدد کرداروں کی شمولیت نے اس پورے قصے کو ایک ہمہ گیر فکری اور تخلیقی تجربے میں منتقل کر دیا ہے۔ یوں بھی اس قصّے کے مرکز میں ایک بین الاقوامی اور عالمی حیثیت رکھنے والے ادبی واقعے کی موجودگی نے، اسے ایک رنگا رنگ اور ایک ساتھ کئی جہتیں رکھنے والی ذہنی اور تخلیقی سرگرمی کے بیان کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ مین بُکر بین الاقوامی انعام ۲۰۱۳ء کے پس منظر میں ایک ساتھ موجودہ ادبی دنیا کے کئی ممتاز لکھنے والوں کی شبیہیں، اس قصے کو ایک اَسرار آمیز ڈرامے کے طور پر بھی سامنے لاتی ہیں۔ اس طرح یہ سفر اس عہد کے فکشن سے مربوط ایک غیر معمولی حیثیّت رکھنے والے واقعے کا بیان بھی ہے، جابجا ڈرامائی عناصر اور ایک جانی انجانی صورت حال کی عکاسی پر مشتمل۔ کمال کی بات یہ ہے کہ آصف نے اس قصے کو بہ ظاہر سامنے کی ایک سچائی یا ایک جیتے جاگتے واقعے کی سطح سے اٹھا کر، اسے ایک تخلیقی واردات اور حیرت و استعجاب کی فضا میں سانس لیتی ہوئی کہانی بنا دیا ہے۔

اس کہانی میں انسانی سوز اور دردمندی کی ایک کیفیت بھی ہے، ہر طرح کے تعصب، جذباتیت اور شخصی ترجیح کے تاثر سے یکسر آزاد اور ایک مورّخ کی جیسی معروضیت سے مالا مال۔ تعلق اور بے تعلقی کے ملے جلے ذائقے نے اس کہانی کو بہت دل چسپ بنا دیا ہے۔

اردو کے معاصر ادبی معاشرے میں آصف فرخی کئی اعتبارات سے منفرد ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایک خاموش اور کبھی نہ بجھنے والی تخلیقی تشنگی، ایک دائم و قائم ذہنی جستجو کی ہم رکاب رہی ہے۔ ادب کے آزادانہ مطالعے کے بے پایاں شوق نے آصف کو اپنے عہد کی سچائی کا بہت

وقیع ترجمان بھی بنا دیا ہے جس کی نظر ایک ساتھ اس عہد کے مزاج کا تعین کرنے والے ہر واقعے کا احاطہ کرسکتی ہے۔ ایک ادبی صحافی، ایک دانشور، ایک تخلیقی فن کار کا رول وہ غیر معمولی انہماک اور ذمے داری کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اور ان کا یہ رول ہر سطح پر اپنی ایک خاص پہچان رکھتا ہے۔ سفر کی یہ روداد آصف کی بیرونی دنیا کے ساتھ ساتھ ان کے اپنے باطن کی دنیا سے بھی پردہ اٹھاتی ہے اور ہمیں ایک ایسے انوکھے سیاح سے ملاتی ہے جو یک رخا نہیں ہے اور جسے کئی زاویوں میں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے ___ اردو میں اس طرح کا سفرنامہ ہمیں صرف قرۃ العین حیدر کے سفر ناموں کی یاد دلاتا ہے جو اپنے تجربے میں آنے والی حقیقتوں اور صورتوں تک رسائی کے لیے اپنی تیسری آنکھ سے کام لینے کا ہنر بھی رکھتی تھیں۔ ایک مدت کے بعد، سفرنامے کی بہ ظاہر عامیانہ اور پامال صنف کی سطح پر، ایک غیر معمولی اور حساس تحریر کا ظہور ہوا ہے۔ حقیقت اور افسانے کا ایسا امتزاج، وہ بھی اس طرح کی نہ تو حقیقت دُھندلاتی ہے، نہ افسانہ بے مزہ ہوتا ہے، کم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے اور اردو فکشن کی تاریخ میں اس تجربے کا نقطۂ کمال قرۃ العین حیدر کے سفر نامے رہے ہیں۔ آصف فرخی کی ترتیب دی ہوئی یہ روداد بھی بہت دنوں تک ہمارے احساسات کا تعاقب کرتی رہے گی۔

۲۳ نومبر ۲۰۱۳ء

شمیم حنفی

پت جھڑ کے رنگ سُہانے

اونچی، بہت اونچی عمارتوں کے شیشے میں ٹورنٹو کا صاف، کھلا آسماں نیلا نیلا تیر جاتا ہے۔ دھوپ لہراتی ہے، پلٹ آتی ہے۔

میں جاگ گیا ہوں۔ نئے شہر میں ہوں۔ اچانک ایک احساس مجھ پر یلغار کرتا ہوا آتا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس مقام میں اور اس وقت پر پاتا ہوں۔

مجھ سے لمحوں کا حساب چھوٹ گیا۔

اس سفر کا آغاز کتنے گھنٹے ہوگئے، کتنے دن، کتنے مہینے، یہ مجھے نہیں معلوم، دونوں ٹانگیں جوڑے اس سیٹ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اعلان ہوتا ہے تو اپنی گھڑی میں سوئی گھما کر وقت بدل لیتا ہوں۔ چلے تھے تو کراچی کا وقت تھا، پھر دبئی کا وقت، پھر لندن کا وقت... اس کے بعد وقت کون سا ہے؟ جہاز کے اندر بھی وقت تیرتا، موج کی طرح سمٹتا اور ہلکورے لیتا نظر آتا ہے۔

Local time at place of origin
Local time at destination

متذبذب ہاتھ گھڑی کی سوئی پر رکے ہوئے ہیں، میں ان دونوں کے درمیان موجود ہوں۔ میرا origin کیا ہے اور destination کون سی؟ مگر اب اس سے بھی فرق نہیں پڑتا۔

میرا وقت کیا ہوا ہے؟

اور پھر نیند ... نیند جو میرے لیے وقت کا پیمانہ ہے، اس وقت واحد ممکن پیمانہ۔ مگر میں نہیں بتا سکتا کہ میں سو کر اُٹھا ہوں یا اُٹھ کر پھر سو گیا ہوں۔ سونے جاگنے کے وقفے کے دوران جہاز اترا، ایئرپورٹ آ گیا اور آدھی رات کے سناٹے میں ڈرائیو کرتے ہوئے ہم شہر میں داخل ہو گئے۔ میں نہ تو سو رہا ہوں نہ جاگ رہا ہوں۔

دُھوپ کے جھماکے نے جگا دیا۔ اپنا آپ واپس دلا دیا۔ سڑک کے دونوں طرف پھیلاؤ کا احساس، بے کراں وسعت، کشادگی، بلند عمارتیں، بادلوں سے خالی نیلا آسمان، ہری بھری گھاس کے تختے، درختوں میں خزاں کے رنگ ...
fall colours درخت کہیں لال بھبھوکا ہیں، کہیں گہرے بھورے، کہیں پتاور کی اپنی سبز رنگت نہیں ڈھلی۔ قطاریں کی قطاریں کھڑی ہیں رنگ برنگے درختوں کی۔ پھولوں میں بھی کیا رنگ ہوتے ہوں گے جو ان پتّوں میں ہیں...!

ہم مس سی ساگا کی سڑکوں پر ڈرائیو کر رہے ہیں۔ انتظار صاحب کو شہر پرسکون نظر آتا ہے، صاف ستھرا اور قاعدے قرینے کا۔ مجھے یہ خالی لگتا ہے۔ کینیڈا کا چھٹا سب سے بڑا شہر ہے، منیر صاحب بتاتے ہیں۔ دو لاکھ ڈھائی لاکھ کی آبادی اب ہمیں کچھ نہیں معلوم ہوتی اس لیے کہ ہم جنوبی ایشیا کے شہروں کے بھیڑ بھڑکے اور شور، ایک مسلسل شور کے عادی ہو گئے ہیں۔ شور ہمارے رگ وپے میں اُتر گیا ہے، جس کی وجہ سے اندر سناٹا گونجنے لگا ہے۔
آدمی بھی خال خال نظر آتا ہے۔ لیکن جو نظر آتا ہے وہ اکیلا یا چند ایک ساتھیوں کے ہم راہ۔ وہ ہجوم کا آدمی نہیں ہوتا۔
آدمی آدمی... مگر یہاں سوال اور ہے۔ ''یہاں چڑیاں نظر نہیں آتیں؟'' انتظار صاحب پوچھ رہے ہیں۔ وہ مسلسل درختوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ میں خزاں کے رنگوں سے سجے پتوں میں گم ہوں۔
منیر صاحب چڑیوں کے معاملے میں سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ چڑیاں موسم میں کس طرح

ہجرت کرنے لگتی ہیں، وہ بڑی تفصیل سے بتاتے ہیں۔ ''بعض دفعہ چڑیوں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔ وہ جنوب کی سمت اڑ رہی ہوتی ہیں، ذرا سی گرمی پڑی تو واپس ہونے لگتی ہیں۔ وہ کنفیوز ہو جاتی ہیں۔ پھر مر جاتی ہیں۔ مری ہوئی چڑیاں بہت نظر آتی ہیں... اور عمارتوں میں جلنے والی روشنی سے بھی دھوکا کھا جاتی ہیں۔ ان کی طرف اڑتی ہوئی آتی ہیں اور شیشے سے ٹکرا کر مر جاتی ہیں۔''
اس کے بعد وہ یہاں ملنے والی سیکڑوں چڑیوں کی قسمیں گنوا دیتے ہیں۔
''یہ عمارتیں بہت صاف ہیں۔'' انتظار صاحب کہتے ہیں، ''ان پر کبوتر یا چیلیں آ کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ان پر پرندوں کی بیٹ کیوں نظر نہیں آتی؟''
شہر کے آس پاس گھاس کے قطعوں میں جب بھی ہم گزرتے ہیں تو منیر صاحب بار بار اشارہ کرتے ہیں، ''دیکھیے، انتظار صاحب وہ رہی چڑیا!''
میں کہتا ہوں چڑیوں کے معاملے میں ہم ان بچوں کی طرح نہ ہو جائیں جنھیں ہر آتا جاتا دیکھاتا ہے، وہ رہی، دیکھو! چیا آئی چیا آئی... اور دیکھتے ہی دیکھتے چیا پھُر سے اڑ جاتی ہے۔
تار پر بہت سی چڑیاں بیٹھی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون سی چڑیاں ہیں۔ ایک دم سے بھرا مار کر اُڑ جاتی ہیں۔

نیند اُڑا کر اڑ گئی چڑیا پھر خاموشی۔
اب نیند سنبھلی۔ اب کہیں جا کر ایک معمول سا بندھا ہے۔ اب میں یہاں کے وقت کے مطابق سو رہا ہوں اور جاگ رہا ہوں۔ ورنہ اتنے دن تک رات گئے چونک پڑنا اور سوچنا کہ میں کہاں ہوں، اس وقت کیا بجا ہے، اب کیا ہونے والا ہے؟
صبح کو آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں بستر میں لیٹا رہتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ گھر والوں کو غسل خانے جانے کی زیادہ ضرورت ہو، انھیں تو دفتر اور اسکول کی پابندی ہے۔ انتظار صاحب صبح اُٹھ کر مفلر لپیٹ کر چہل قدمی کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

''ایک معاملے میں کینیڈا پاکستان سے ہیٹا رہ گیا۔'' ایک صبح وہ ہمیں ناشتے کی میز پر

بتاتے ہیں۔ درختوں اور چڑیوں پر ان کی حیرت بھری خوشی ابھی کم نہیں ہوئی ہے۔ ''اور وہ بے گلہری کا معاملہ۔ یہاں کی گلہری جس قدر بدصورت، کالی کلوٹی اور بھدی ہے، ہماری گلہری اتنی ہی اچھی ہے۔''

وہ یہاں اور وہاں کی گلہریوں کے فرق کو واضح کرنے لگتے ہیں۔ منیر صاحب گلہری اور چپ منک "chipmunk" کا فرق سمجھانے لگتے ہیں۔ میں چائے کا ایک گھونٹ بھرتا ہوں۔ دوسری پیالی بھی پیوں گا، یہاں چائے بہت ہلکی بنانے کا رواج ہے۔ یہ چائے بھی دُم کٹی گلہری معلوم ہوتی ہے۔

شہر تو صاف ہے، قرینے کا ہے مگر اوہ، فاصلے...
وقت سے بھی زیادہ مشکل ہیں فاصلے۔
ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے میں گھنٹے دو گھنٹے گزر جانا ایک معمول ہے۔ میں اس دوران سو جاتا ہوں، پھر چونک اٹھتا ہوں، اب ہم کہاں آ گئے؟

اب ہم یہاں ہیں۔ اس شہر کو دیکھ رہے ہیں، یہاں کے لوگوں سے مل ملا رہے ہیں۔ دیکھنے کے لیے اتنا کچھ ہے اور ملنے کے لیے لوگ بھی بہتیرے، دیسی پردیسی... جو ہمارے لیے دیسی ہیں وہ یہاں پردیسی ہیں...

''کمیونٹی'' کے ایک بزرگ شہری کے ہاں چائے کی دعوت... اب ہم چائے کی دعوتوں کے اس سرکٹ میں آ گئے ہیں... اور ملتے ہی فوراً رشتوں کی کھوج کہ کہیں نہ کہیں کوئی نقطۂ اشتراک نکل آئے۔ بزرگ شہری مجھے بتاتے ہیں کہ جب وہ کراچی میں تھے تو میرے نانا کے بڑے بھائی کے ساتھ کام کرتے تھے۔

اس کو کتنے سال ہو گئے ہوں گے، میں سوچنے لگتا ہوں مگر وہ بزرگ شہری اب انتظار صاحب سے ان کے اُن ماموں کی خیریت پوچھ رہے ہیں جو پاکستان بننے سے پہلے سی پی میں

ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ان سب لوگوں کو یہاں قدم جمائے ہوئے کئی کئی برس ہو گئے۔ آرام دہ زندگیاں، پروفیشنل مہارت والی نوکریاں ...ادب کا چسکا اس سب کو کیوں خراب کیے دیتا ہے؟

چائے کے ساتھ ساتھ باقاعدہ گفتگو کا آغاز ہوا۔ ایک صاحب نے سوال پوچھا جو پوری تقریر سے کم نہیں تھا۔ سوال کے اندر کتنے ہی سوال تھے۔ اس کا کوئی سرا پکڑا ہی نہیں گیا۔ انتظار صاحب نے سوال کو کرکٹ کی نوبال کی طرح کھیلا۔ ''میں اس کا جواب کیسے دوں؟ یہ کیسے بتاؤں کہ کن موضوعات اور کن مسائل پر کیا لکھتا رہا ہوں؟ میں اس طرح مسائل طے کر کے لکھنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں نے جو لکھا ہے، وہ آپ کے سامنے ہے، پڑھ کر دیکھ لیجیے۔''

بس، یہی کام ان لوگوں نے نہیں کیا۔ اپنے نیک ارادوں، اچھی گفتگو اور اس گرم چائے کے باوجود جس کے ساتھ Cookies بھی ہیں اور آلو چھولے بھی...

پہلے تو میں چپ رہا۔ پھر بولے بنا نہیں رہ سکا۔ پاکستان میں وجود میں آنے والا ادب اور پاکستانی معاشرے کے مسائل کی عکاسی، ادب اور حب الوطنی کی لازمی سند، تقسیم اور آزادی کے بعد سماجی ڈھانچے کی جو شکل ابھری۔

خیر، بولنے کو تو میں بول گیا، بعد میں ایک صاحب سے بری طرح بھڑ گیا۔ مجھے اس پر حیرت نہیں ہوتی کہ لوگ بالعموم ان حالات کی شدّت سے بے خبر ہوتے ہیں جن سے کراچی پچھلے پانچ دس سال میں گزرا، مگر وہ سمجھتے ہیں کہ انھیں سب پتا ہے، کون موردِ الزام ہے؟ ہم دردی اور دل سوزی تو دُور کی بات ہے، وہ اس شدومد سے اپنی رائے ایک مطلق حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے، موجِ خوں جب شہر والوں کے سر پر سے گزری تو یہ یہاں کنجِ عافیت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نہیں، مگر مجھے اتنا تلخ نہیں ہونا چاہیے۔ دوسروں کی زندگیوں پر حکم لگانے والا میں بھلا کون؟

ایک اور طویل ڈرائیو کے بعد کینیڈا کی مصوری کے عجائب گھر مک مائیکل میں۔ اس کی سیٹنگ پارک کی طرح ہے۔ رنگ بدلتے درخت، سبزے کی افراط، صاف ستھری روشیں، پیڑوں

پودوں کا ایک ہرا بھرا سکوت ... سامنے لکڑی کا وہ کیبن ہے جس میں مشہور مصور تھامسن تصویریں بنایا کرتا تھا۔ پورے کا پورا کیبن ہی شمالی علاقوں سے یہاں اٹھا کر لے آئے ہیں۔ تھامسن ڈوب کر ہلاک ہوگیا تھا۔ ایک دھندلی سی تصویر کیبن کی کھڑکی کے شیشے پر چپکی ہوئی ہے۔ اندر جھانک کر دیکھا تو اس کا ساز و سامان جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔ وہی پیڑ پودوں کے سے سکوت کے ساتھ۔ یہاں ہر چیز کے ساتھ یہ سکوت کیوں ہے؟

ہم اندر چلے گئے۔ بے حد منظم، یہاں کی ہر جگہ کی طرح، تیر کے اشاروں پر چلتے رہے، یہاں کوٹ ٹانگو، یہاں قطار بناؤ، یہاں ٹکٹ لو، وہاں پیشاب کرنے کی جگہ ہے، یہ سامنے گفٹ شاپ ہے (جو ہر جگہ موجود ہے۔ یہاں آئے ہو تو سوینیئر ضرور لے کر جانا ہے۔ لوگ خرید رہے ہیں، خریدے جا رہے ہیں ...)

اندر ریستوراں کا کھانا واجبی سا ہے، مگر کھڑکی کے باہر کا منظر نہایت عمدہ ہے۔ درختوں کے پرے کے پرے، ایک گھنا جنگل، جیسے یہ درختوں کے پتے نہ ہوں، درختوں پر چڑیوں کے سے پر نکل آئے ہوں، سرخ، نارنجی، سنہرے ... دھوپ میں چمکتے ہوئے ... اور ان پروں سے ابھی یہ درخت اُڑ جائیں گے، پھر اس ٹنڈ منڈ منظر میں کیا رہ جائے گا؟ خالی میوزیم کی دیواریں، سیاحوں کے کیمرے، جلاوطنی۔ اور ہاں، گفٹ شاپ کو مت بھولیے۔

یہ پورا مکان کسی مخیّر شخص نے عطیے کے طور پر دیا کہ یہاں کینیڈا کا قومی آرٹ محفوظ رکھا جائے۔ ہم تصویریں دیکھنے کے لیے اندر داخل ہوئے ہیں۔ یہ گروپ آف سیون کی تصویریں ہیں، کینیڈا کے مخصوص مناظر ... ان سات مصوّروں نے اس صدی کے دوسرے، تیسرے عشرے میں کینیڈا کے ایک منفرد اسلوب کو تلاش کرنا شروع کیا، ایک نئی ثقافتی بیداری، اظہار کے نئے راستے اور ایک قومی امنگ کا فن کارانہ احساس ... ان کے کام سے اور ان کے ثقافتی نصب العین سے دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے۔ ایک ایسے ہی راستے سے ہم بھی گزرے ہیں مگر نہ تو تصویریں جمع کر کے رکھی ہیں نہ کتابیں ... پاکستان کی نیشنل گیلری بننے کی تجویز کا خدا جانے کیا ہوا ہے؟ اب تو اس کا ذکر بھی سننے میں نہیں آتا اور ارادہ بھی ہوا تو اس کے بننے میں برسوں لگ جائیں گے۔ پھر اس کا حشر بھی وہ ہوگا جو بیشتر قومی اداروں کا ہوتا ہے۔ خالی فریم،

تصویروں سے عاری دیواریں، ایک ایسی کتاب جس کے ورق سادہ ہیں۔

مگر میں ان تصویروں سے گزر کر اوپر کی اس گیلری میں آجاتا ہوں جہاں اسکیمو اور ریڈانڈین لوگوں کا آرٹ دکھایا گیا ہے۔ ''پہلی اقوام'' ان لوگوں کو ایک معزز خطاب دیا گیا ہے۔ سننے میں بھاری بھرکم یہ نام اس قتل و غارت گری پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش ہے جو سفید فام آبادکاروں نے اس سرزمین کے اصلی باشندوں پر روا رکھی۔

اس کے باوجود یہ تصویریں اور نقوش، گوشت پوست اور خون سے عاری نہیں ہیں۔ ان کی اپنی زندگی ہے، اپنی لکیریں اور اپنا وقت... پچھلی مرتبہ جب دو سال پہلے یہاں آیا تھا تب بھی یہی دو باتیں یاد رہ گئی تھیں... گروپ آف سیون کا اُٹھایا ہوا ''کینیڈا کے آرٹ'' کا سوال اور ''پہلی اقوام'' کی تصویریں۔

سوال ایک کا اچھا ہے اور تصویریں دوسرے کی۔ مگر ہم باہر نہیں نکل سکے۔ تیز بارش شروع ہوگئی ہے۔ چلے تھے تو دھوپ تھی۔ چھتری یا رین کوٹ رکھے نہیں۔ بارشوں کے ساتھ سردی بڑھ رہی ہے۔ درجۂ حرارت ایک دم گرنے لگا اور یہ بارش کی بوندیں نہیں ہیں، یہ چھوٹی چھوٹی سفید گولیاں... میوزیم کی عمارت کے سامنے روش پر سفید کنکریوں کا ایک ٹھنڈا فرش بچھ گیا ہے۔ میں شیشے کے پیچھے سے ژالہ باری دیکھ رہا ہوں۔ درخت خزاں کے پتوں سے لدے کھڑے ہیں اور سرخ، سنہری پتوں کے سامنے یہ سفید، سفید کنکر برس رہے ہیں۔ ہم باہر نکل کر گاڑی تک بھی نہیں جاسکتے۔ لیکن پھر بھی کرنا تو یہی ہے۔ بھیگتے ہوئے اور بھاگتے ہوئے ہم گاڑی تک پہنچتے ہیں... پھر واپسی کی ڈرائیو۔

ہمارے میزبان جون ایلیا کے شاگرد ہیں، باضابطہ بلکہ ان کا تخلص بھی بھائی جون کا عطا کردہ ہے۔ وہ گاہے بہ گاہے بھائی جون کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے جون ایلیا کا ایک شعر سنایا گاڑی سے ٹورنٹو جاتے ہوئے، ہائی وے ۴۰۱ پر نکل کر، جس پر ٹول ٹیکس کا خودکار نظام ہے، کیمرہ میلوں کا حساب ریکارڈ کرلیتا ہے، گھاس کے ہرے بھرے قطعوں کے درمیان کسی ایگزٹ کی طرف مڑتے ہوئے:

ہم نادرہ جویاں کو وہ راہ خوش آئی ہے
جو آبلہ پرور ہے بے مرہم منزلہا

تیر کا ایک نشان بتاتا ہے سڑک کے کس موڑ سے جانا ہے۔ فاصلے، بے پناہ فاصلے...ان فاصلوں کے ایک سرے پر میرا گھر۔ بے مرہم منزلہا...

گھر سے دور ایک گھر، کتابوں اور تصویروں سے مزین۔ یہ بیدار بخت کا گھر ہے جہاں انھوں نے بہت سی نادر کتابیں جمع کر رکھی ہیں۔ اندر زینے کی طرف مدھو بالا کے مسکراتے ہوئے قد آدم پوسٹر کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے میں کتابوں کا جائزہ یہ سوچتے ہوئے لیتا ہوں کہ انھوں نے یہ خزانے کہاں کہاں سے جمع کیے ہوئے ہیں۔ بیدار بخت کمپیوٹر کے پرنٹ آؤٹ لیے ہوئے آتے ہیں جس پر منیب الرحمٰن صاحب کی نئی نظمیں ہیں۔ میں ان نفیس، ترشے ترشائے مصرعوں کی ٹھنڈک میں کھو جاتا ہوں۔

بیدار بخت صاحب اور ان کی بیگم کے ساتھ درگا پوجا دیکھنے کے لیے۔ شام ٹھنڈی ہوگئی ہے اور گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے اب کپکپی چڑھ رہی ہے۔ شہر کے اندر بہت سی گلیوں سے گھومتے ہوئے کسی جگہ پارکنگ تلاش کرتے ہوئے ایک چوکور سی عمارت میں ہم داخل ہو جاتے ہیں۔ باہر شہر کے نیم خوابیدہ اور یخ بستہ سے منظر کے مقابلے میں یہاں دروازہ کھولتے ہی منظر بدلا ہوا ہے۔ ساڑیاں پہنے ہوئے زرق برق خواتین، بہت سے مرد، بنگالی الفاظ کی فراوانی جس کے بیچوں بیچ Canadian کی انگریزی کے کلی پھندنے، لوگوں کا ایک دوسرے سے ملنا، سلام دعا...

اوپر اسٹال لگے ہوئے ہیں۔ ساڑیاں، کپڑے، چاٹ اور کھانے پینے کی چیزیں۔ ایک اسٹال پر کیسٹ اور کتابیں ہیں۔ بنگالی کتابوں کے درمیان چند ایک کتابیں انگریزی کی۔ مہاشویتا دیوی کے ترجمے اور دوسرے بنگالی ناول، کتابیں ہندوستان کی، قیمتیں ڈالروں میں۔ میں افسوس کے ساتھ کتابیں واپس رکھ دیتا ہوں۔

اندر کے کمرے میں اسٹیج بنا ہوا ہے جس پر درگا زبان نکالے اور بہت سے ہاتھوں میں

کچھ نہ کچھ سنبھالے ہوئے، جلو میں سرسوتی اور لکشمی کو لیے اپنے شوہر کے ڈھلتے ہوئے جسم پر جلوہ افروز ہے۔ ایک طرف مائک کے سامنے کچھ گانا بجانا ہو رہا ہے۔ ہم کرسیاں کھینچ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ''پوجا کا سیشن ابھی اسٹارٹ ہونے والا ہے'' کوئی ہمیں بتاتا ہے۔ ہم تھوڑی دیر گانا سنتے ہیں۔ انتظار صاحب کو اونگھ آجاتی ہے۔ ہم وہاں سے روانہ ہو جاتے ہیں۔

یہ منظر مجھے اجنبی یا عجیب سے زیادہ مانوس کیوں لگا، میں سوچنے لگتا ہوں۔ پھر یاد آتا ہے، ایک مرتبہ عید کی نماز لندن کی ریجنٹ اسٹریٹ میں پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ہو بہو یہی منظر، چند تفصیلات کا فرق تھا۔

طاہر اسلم گورا سے ملاقات۔ موصوف ان لوگوں میں سے ہیں جو انگلستان میں ہوتے تو ان کی بایوگرافی لکھی جاتی، لارنس آف عربیا کے طرز میں یا کم از کم جاسوسی فلم ضرور بنتی۔ ان کے دوستوں کے چھوٹے سے گروپ کے ساتھ ''طباق'' میں نشست۔ صرف نام ہی نہیں، ہوٹل کا انداز اور کھانے بالکل لاہوریا انداز کے ہیں۔ نان، تکّے، رائتہ ... اسی طرح کی میزیں، ان میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اور ان کی اسی طرح کی باتیں۔ ایک صاحب ہیں جو پنجابی اور اردو میں شعر کہتے ہیں اور یہاں اس الزام کا سامنا کر رہے ہیں کہ پنجابی زبان کی بات کرنا ملک توڑنے کی سازش ہے۔ یہ اعتراض ان لوگوں کی طرف سے زیادہ آیا ہے جن کی مادری زبان پنجابی ہے۔ ملکی زبانوں کے بارے میں یہ مجرمانہ سی خلش کیوں ہے؟ ایک اور صاحب جو ٹیکسی بھی چلاتے ہیں اور کہانیاں بھی لکھتے ہیں۔ ایک نوجوان جو کراچی سے آئے ہیں، سلیم احمد اور قمر جمیل کی آنکھیں دیکھے ہوئے، ان کے گھر میں نشستوں میں شریک ہو چکے ہیں۔ یہ سارے لوگ ان کے متنوع پس منظر، یہ یہاں adjust کیسے کرتے ہیں، ان کا immigrant experience ان کی تحریروں میں کتنا جھلکتا ہے؟

طاہر اسلم گورا یہاں اردو کا ہفتہ وار اخبار نکالتا ہے۔ اخبار مفت تقسیم ہوتا ہے اور اشتہاروں پر چلتا ہے۔ وہ اخبار نکالنے کے قصیے، بکھیڑے ہمیں سناتا ہے... خاص طور پر، جس طرح کی تنقید کا

سامنا اسے کرنا پڑتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک پاکستانی فوجی جنرل یہاں آئے اور ان کو پریس کانفرنس میں کچھ اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا... جس کی خبر ہمارے پاکستانی اخباروں نے شائع نہیں کی، سوائے لاہور کے ایک انگریزی ہفتہ وار پرچے کے... اس اخبار نے ا[illegible] چند تفصیلات شائع کردیں تو اس پر لوگوں کا اعتراض کہ ایسا کیوں کیا، گھر کی بات گھر ہی میں رہتی۔

مگر بات تو اب بھی گھر ہی میں رہی۔ دیسی ریڈر شپ کے بہت محدود حلقے سے باہر کہاں گئی۔ خود اس حلقے کے علاوہ [illegible] روں کو [illegible] پڑھتا ہے، کون ان پر سر دُھنتا ہے؟

اسی طرح wife abuse اور گھریلو تشدد کے بارے میں مضمون پر اعتراض کہ ایسا نہیں ہوتا، اور ہوتا بھی ہے تو اس کا ذکر کیوں کریں؟ یہاں آکر ہمارے لوگوں میں denial کی کیفیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

شاید اس لیے کہ وہ پاکستان کو آئیڈیلائز اس حد تک کرنے لگتے ہیں کہ اس کے معاشرے کے اسقام کا ذکر انھیں پاکستان پر حملہ معلوم ہوتا ہے۔ ''پاکستان ان لوگوں کا ڈبائی بن گیا ہے''، میں انتظار صاحب سے کہتا ہوں۔

''پاکستانی جہاں جاکر آباد ہوتے ہیں تو وہ دو طرح کی مخلوق کو بلاتے ہیں، ایک مشاعرے کے شاعر اور دوسرے ملّا۔'' انتظار صاحب کہتے ہیں۔

انتظار صاحب جشن سے بچ گئے۔ رائٹرز فورم نے ان کے ساتھ شام منائی۔ مظفر اقبال نے تقریر کی، میں نے مضمون پڑھا۔ جشن منانا ہمارے ادیبوں کا کُل وقتی مشغلہ بن گیا ہے، خاص طور پر اُن ادیبوں کا جو لکھنے سے ''کڑک'' ہوگئے۔ ان کے لیے یہ جشن منانے کی بدعت بھی غیر ملکوں میں مقیم پاکستانیوں نے ایجاد کی اور اس پر مشاعرہ گویا پان پر قوام۔ سارے ثقافتی، تہذیبی تقاضے پورے ہوگئے جب واہ، واہ کے فلک شگاف نعرے لگا کر، ڈنڈا سے ہاتھ جھلاتے ہوئے گھر واپس چلے آئے۔

ہم شاید دنیا کی واحد قوم ہیں جو اپنی تہذیب پر اس قدر فخر و مباح کرتے ہیں، اس کی اساس کو سمجھے بغیر اور اس کے فروغ کے لیے کچھ کیے بغیر۔

ٹورنٹو، اکتوبر ۲۰۰۰ء۔ میں اپنی خزاں کی نوٹ بک کھولے بیٹھا ہوں۔ گرتے پتوں، اُڑتے لمحوں کا بہی کھاتا۔ نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں کہ کھڑکی کے باہر ایک گلہری بھاگ رہی ہے اور دوسری گلہری اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ دونوں گھاس میں غائب ہو جاتی ہیں۔ پھر سکوت۔ ذرا دیر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ گھاس کے اسی ٹکڑے پر تیز تیز قدم رکھتا ہوا ایک سکھ جا رہا ہے۔ میں ذرا حیرت سے اسے دیکھتا ہوں۔ اس کی داڑھی اور پگڑی نمایاں ہیں میں اس کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہتا ہوں مگر وہ مجھے کیا جانے، کیا سمجھے۔ آدمی گلہریوں سے بھی زیادہ دور اور اجنبی ہیں۔

سابق وزیراعظم پیئر ٹروڈو کا ماتم اب بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے (''دی لانگ گڈ بائے'') انھیں کینیڈا کی لبرل، کثیر ثقافتی اور ''کشادہ'' پالیسی کے معمار کے طور پر سراہا جا رہا ہے۔ منیر صاحب نے ''وطن'' اخبار میں اس موضوع پر کالم لکھا ہے۔

لیکن خراجِ عقیدت پیش کرنے کے بعض طریقے بہت عجیب ہیں۔ موجودہ وزیراعظم صاحب کا ارادہ ہے کہ کینیڈا کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ لوگن کا نام ٹروڈو کے نام پر رکھ دیا جائے۔ موجودہ نام ایک مُہم جو ماہرِ ارضیات کے نام پر ہے۔ اس تجویز پر مصنف ولیم بروس نے آج (۲۱ اکتوبر) کے ''دی گلوب اینڈ میل'' اخبار میں The Peak of Impudence نام سے بڑا سخت مضمون لکھتے ہوئے سر ولیم لوگن کی ہمہ جہت شخصیت کو اجاگر کیا ہے۔ نام بدلنے کی تجویز کو وہ ''اپنی تاریخ سے کینیڈا کی بے خبری'' قرار دیتے ہوئے موجودہ وزیراعظم کے بارے میں لکھتا ہے:

Jean Chretien thus reveals himself as a politician who does not give a pinch of beaver dung about Canadian history.

ہمارے سیاست داں قومی تاریخ میں خود بیور کے گوبر کا چٹکی بھر سے کہیں زیادہ اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

ٹورنٹو کی شام۔ کئی منزلہ عمارتیں اندھیرے میں جگمگا اٹھی ہیں۔ کہیں شیشوں کا رنگ سنہری ہے، کہیں تانبے کا، کہیں نیلگوں، کہیں سرخی مائل (''یہ خصوصی طور پر پروسیس کیا ہوا شیشہ ہے''

منیر صاحب بتاتے ہیں)۔ خالی عمارتوں میں بتیاں جل رہی ہیں، ٹریفک رواں دواں ہے، گاڑیوں کی بتیاں جھلملا رہی ہیں۔ ہماری گاڑی کے باہر ہوا سرد ہے۔ اب میں بھاری کوٹ کے بغیر باہر نہیں نکلتا۔ سر کو سردی سے بچانے کے لیے انتظار صاحب ایک نیلی ٹوپی پہنتے ہیں۔ میں اس ٹوپی میں ان کی تصویر کھینچوں گا۔

موبائل فون کا اشتہار جو بل بورڈ پر نصب ہے:

So what if people think you are talking to yourself ?

واقعی۔ یہ تو اس نوٹ بک کا سوال ہے اور ایک نوٹ بک کیا، پورا ادب ہی اس بہ ظاہر خود کلامی کا شاخسانہ۔ لوگ سمجھتے ہیں تو کیا، لوگوں کا تو یہ کام ہی ہے ...

نائٹ کلب۔ باہر ایک عام سی پارکنگ، اندر داخل ہوتے ہی شبنمی اندھیرا، تیرتی ہوئی سبز، سرخ، نیلی بتیاں، بتیوں کے دائرے میں ناچتی ہوئی لڑکی، لڑکی کے ہاتھ اٹھے ہوئے اور بند قبا دھیرے دھیرے وا ہوتے ہوئے ... داغ ہوں اس کی بے حجابی سے ... موسیقی تیز ہوتی ہے، لڑکی روشنی کے دائرے میں مچل رہی ہے، اسٹیج کے ساتھ سیڑھیاں ہیں، ان کے اوپر کوئی شخص بیٹھا ہوا اناؤنس منٹ کر رہا ہے: ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین ...'' تالیاں گونجتی ہیں، روشنیوں کا رنگ بدلتا ہے، ایک نئی لڑکی آتی ہے، ایک نیا بدن آنکھوں کے سامنے کھلتا ہے۔

مگر وہ جو آخر میں آئی مجھے ذرا نہ بھائی۔ اعلان تو اس کے لیے ایسا ہوا کہ یہ یوں ہے، ووں ہے، جنسی فلموں کی معروف اداکارہ ہے، ماڈل ہے ... وہ خود اپنے ہی اوپر رال ٹپکا رہی تھی، بوسے اچھال رہی تھی، اسٹیج کے سامنے بیٹھے ہوئے چند لڑکے بہت جوش میں تھے (مگر بے قابو نہیں) اس سے کہیں زیادہ اچھی تو سیاہ لباس میں سنہری بالوں والی لڑکی تھی جو کافی اور مشروبات سرو کر رہی تھی۔

روشنی کی یہ فراوانی سر چکرا دینے کے لیے کافی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ کسی نے پارکنگ لوٹ کے سنسان منظر پر جھانکتے ہوئے چاند کی طرف اشارہ کیا۔ نیم وا، اُجلا ...'' چاند بھی

اسٹرپ ٹیز کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

میرے برابر کھڑا ہوا طوبے ہنس پڑا۔ "زندگی سب کو اسٹرپ ٹیز کرواتی ہے۔" اس نے کہا۔

مجھے اندازہ تھا کہ وہ بڑی مشکلات طے کر کے یہاں تک آیا ہے۔ "مگر کلب کی ان ڈانسرز کے برخلاف، آدمی کی مرضی اس اسٹرپ ٹیز میں شامل نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔ "اور ہم ایسے لوگوں کو زندگی کی اس رقاصہ کو اپنے الگ چیمبر میں لے جا کر پرائیویٹ ڈانس دیکھنے کی عیاشی نہیں میسر ہوتی۔"

شام ہی کو اس نے مجھے اردو کے ان مشہور ادیب کے بارے میں بتایا تھا جن کے لیے یہ کلب "مشاہدہ" نہیں "تجربہ" بن گیا تھا۔

ٹورنٹو کے مختلف رنگ۔ یہ ایرانی حصہ ہے، یہاں دکانوں کے نام فارسی میں ہیں، ایرانی مصنوعات بکتی ہیں۔ ڈین فورتھ کا علاقہ یونان سے باہر ایک اور یونان ہے۔ جیرارڈ اسٹریٹ میں ہندوستانیوں پاکستانیوں کی بہتات ہے۔ دنیا بھر کے کن کن درختوں سے ٹوٹے ہوئے پتے اُڑ کر یہاں آئے ہیں۔ یہاں تو خزاں کے رنگوں ہی سے بہار ہے۔

کراچی کا ظفر۔ کتنی ہی شاموں کی بے نام، بے تکلف محفلوں میں موجود ایک چہرہ جو اب یہاں آن کر ملتا ہے۔ میں پی ایم اے ہاؤس کی اس شام میں شریک نہیں تھا جب شیر شاہ نے اس کے جانے کے سلسلے میں دوستوں کو کھانے پر بلایا تھا اور حارث نے الوداعی نظم پڑھی تھی۔ میں ایسے لوگوں کو ایک ایک کر کے جاتے ہوئے دیکھ کر اداس ہوتا ہوں۔ مگر وہ کراچی میں اور کیا کرتا؟ نوکری مل کے نہیں دیتی تھی۔ فقرے بازی اور ایک بے پروا، بوہیمین اسٹائل پر آدمی کب تک گزارا کرے اور وہ بھی کراچی جیسے، روز بہ روز مشکل ہوتے ہوئے شہر میں رہنے کے لیے؟ اب الوداع کہنے کا وقت ہے، حارث کی نظم یوں آگے بڑھتی ہے...

نیاگرا فالز۔ پانی کے پرقوت بہاؤ میں وحشت کا رنگ ہے۔ تیز بہتا ہوا نیلا پانی جب چٹان سے گرنے لگتا ہے تو اس کا رنگ پیچ دار سبز ہو جاتا ہے، بالکل ان شیڈز کی طرح جو Onyx میں ملتے ہیں اور اتنا ہی ساکت ... پانی کے اچھال میں گرج ہے، دھاڑ ہے اور اس کے اثر سے دور دور تک خنکی۔ لیکن ان لوگوں نے نیاگرا، طاقت ور نیاگرا کو زنجیر بستہ کر رکھا ہے۔ اسے ایک پالتو چیتے کی طرح محض نمائش کی چیز بنا دیا ہے۔ جوق در جوق سیاح اسے دیکھنے آتے ہیں، اپنی آمد کے سوونیئر خریدتے ہیں، خوش ہو کر گھر چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک پارک کا حصہ معلوم ہوتی ہے، اس زندہ اور فراواں فطرت سے بچھڑی ہوئی جس نے اس براعظم پر اس قدر فیاضی دکھائی ہے۔ تڑپتا ہوا جذبۂ بے کراں، زیر عناں...

نیاگرا فالز ہو لیے (''Done it'' سیاحوں کی زبان میں) تو اب سی این این ٹاورز بھی دیکھ لو کہ شہر کے عجائبات کا چکر پورا ہو۔ دنیا کے سب سے بڑے، اکیلے کھڑے ہوئے ٹاور کی اوپری منزلوں کی طرف جا رہے ہیں ہم۔ اچھے سیاحوں کی طرح تصویر کھنچواتے ہیں (اس کے پیسے الگ ہیں) ۱۴۴ منزلوں کی اونچائی سے جھانکتے ہوئے کافی پیتے ہیں، پھر Sky-pod کی جانب روانہ ہو جاتے ہیں جہاں بادل ہمارے قدموں تلے ہلکورے لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

''کیا قطب مینار ایسا نہیں ہو سکتا تھا؟'' انتظار صاحب پوچھتے ہیں۔ ان کو Sky-pod تک جاتے جاتے چکر آ گیا تھا۔ مجھے چکر آیا اور وہ بھی بڑے زور سے ''گلاس فلور'' پر۔ اس کی چھت نہیں، فرش شیشے کا ہے۔ نیچے جھانک کر دیکھو تو چودہ سو فٹ گہرائی قدموں تلے سرکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ میں نے مضبوطی سے دیوار تھام لی اور فرش پر سے پاؤں اُٹھا لیے۔

''ارے بھئی، جون ایلیا تو یہاں آ کر لیٹ گئے تھے۔'' منیر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ کتنے ہی سیاح لیٹ لیٹ کر اور لوٹ لوٹ کر تصویریں کھنچوا رہے ہیں۔ میری ہتھیلی تک میں پسینا آ رہا ہے۔

بھائی جون تو ہمہ وقت ایسی ہی چکرا دینے والی اونچائی پر رہنے کے عادی ہیں، انھیں کیا چکر آئے گا؟ میں اپنے آپ کو سمجھاتا ہوں۔

میں کتنے بہت سے نام سوچتا ہوں۔

جب خزاں کے پتے رنگ بدل رہے تھے۔ ایک شہرِ خزاں کے پتوں جیسا۔ خزاں کے پتوں کا شہر۔ خزاں نامہ۔ شہرِ خزاں، شہر برگ خزاں۔ رنگ بدلتا پت جھڑ، پت جھڑ کے رنگ سہانے۔

یہ سب نام قبل از وقت ہیں۔ میں اس لڑکی کی طرح بن کر رہ گیا ہوں جو دل بر کو دیکھتے ہی پہلے بچے کا نام سوچنے لگتی ہے۔ میرے لیے اس تجربے... کسی بھی تجربے سے... پوری کتاب اخذ کرنا مشکل ہے۔ دیکھنے، یاد کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ کہاں تک جذب کریں؟ پتے تو بکھر جاتے ہیں۔

سفر تو اصل میں انتظار صاحب کر رہے ہیں (''اکیسویں صدی میں میرا پہلا سفر'' وہ مجھے بناتے ہیں)۔ میں ان کے احترام میں دھوپ کا رخ چھوڑ دیتا ہوں۔ میں وزٹ ویزا پر آیا ہوں۔ آج ہوں، کل گزر جاؤں گا۔

میں پڑھ رہا ہوں۔ منیر صاحب کے تہ خانے کا ایک حصہ کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ میں ان کتابوں کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں جنھیں میں دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ میں ہیرلڈ بلوم کی تنقید سے روشناس ہوتا ہوں۔ مارگریٹ ایٹ وڈ کا تازہ شائع ہونے والا ناول خریدتا ہوں (''نئے بیسٹ سیلر پر ۴۰ فی صد سیل۔'' دکانوں میں قد آدم پوسٹر دعوتِ مطالعہ دیتا ہے۔ دعوتِ مطالعہ جو میرے لیے دعوت خرید ہے۔ میں اپنے آپ کو روک نہیں پاتا۔) کالوینو، سارا میگو، مینگوئیل، چومسکی... میں اپنے مطالعے کے gaping holes بھرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ شگاف پھر پڑ جائیں گے!

صبح سویرے بستر چھوڑنے کے بعد اخبار اٹھانے کی ورزش۔ عام اخبار دو ڈھائی سیر سے کم کا کیا ہوتا ہوگا۔ اپنی پسند کے سیکشنز نکال کر الگ کر لوں تو اخبار کا پڑھنا ممکن ہوتا ہے۔ یوگوسلاویا (''کیا ایسا ہونا پاکستان میں ممکن تھا؟'' ہر شخص اقتدار کی اس منتقلی پر سوال کرتا ہے) فلسطین، سری لنکا میں مسز بندرانائیکے کا انتقال۔ چند ایک خبریں بین الاقوامی ہیں۔ باقی

سارے مسئلے مقامی، مثلاً کوڑے کرکٹ کی لڑائی، شہر ٹورنٹو کی انتظامیہ یہ فیصلہ کر رہی ہے کہ شہر بھر کا جمع شدہ کوڑا ریل کے ذریعے شمالی علاقوں میں بھجوا دیا جائے یعنی dump کرنے کی پالیسی۔ اس پر "ماحولیات دوست" لوگ احتجاج کر رہے ہیں۔ اخباروں میں بحث کا سلسلہ جاری ہے۔

لیکن میں اس بحث میں اس سے زیادہ نہیں پڑنا چاہتا۔ Dumping کا یہ معاملہ ثقافت میں بھی تو ہوتا ہے۔ کینیڈین آرٹ کے حوالے سے اس پر زیادہ بحث کیوں نہیں ہوتی؟ اخبار میں ایک مضمون بورڈ کے ٹرسٹیز کی اس مقدمہ بازی پر چھپا ہے کہ میک مائیکل میوزیم میں "اصلی تے وڈّی" کینیڈین آرٹ ہی نظر آئے۔ یہ قضیہ بھی اتنی آسانی سے تصفیہ طلب ہوتا نظر نہیں آتا۔

مارگریٹ ایٹ وڈ میرے لیے اس سفر کی دریافت ثابت ہو رہی ہیں۔ ان کے ناولوں کا انداز پرانی انیسویں صدی تک پہنچتا ہوا معلوم ہوتا ہے، جارج ایلیٹ کا Novel With Ideas۔ یہاں کینیڈا میں تو ان خاتون کو ایک "زندہ قومی یادگار" کا درجہ حاصل ہے۔ ان کے خطبات کا مجموعہ Strange Things میں نے سرھانے رکھا ہوا ہے۔ جب نیند اچٹتی ہے تو چند صفحے پڑھتا ہوں، پھر رکھ دیتا ہوں۔

اس کی ایک دل کشی یہ ہے کہ اس کے موضوع کے بارے میں مجھے مطلق کچھ نہیں معلوم۔ کینیڈا کے انتہائی شمالی علاقوں کا بیان ادب میں۔ خاص طور پر وہاں کی لوک ریت رسم کے حوالے سے۔

A great deal has been made, from time to time, of the search for "the Canadian Identity"; sometime we are told that this is simply some thing we have mislaid, like the car keys, and might find down behind the sofa if we are only diligent enough, whereas at other times we have been told that the object in question does`not really exist and we are pursuing a phantom. Sometimes we are told that although we don`t have one of these "identities," we ought to, because other countries do.

وہ اس بات کا ذکر کرتی ہے کہ کینیڈا میں بھوتوں کے قصے، رومانوی مزاج فرانسیسیوں کے بجائے انگریزی دان لوگوں نے زیادہ لکھے ہیں جو خشک مزاج مشہور ہیں۔ رابرٹسن ڈیویس نے

"The embodiment of Canada... cold and cautious on the outside, dowdy and fussy in every overt action, but inside a mass of intution and dark intimations."

ایٹ وڈ کا تبصرہ:

Boringness, in anglophone Canadian literature and even sometimes in real life, is often a disguise conceding dark doings in the cellar.

تہ خانے میں خواب سرسرا رہے ہیں اور ان ہی سے ادب جنم لیتا ہے۔

بوریت، بوریت، زندگی کا لازمی جوہر ہے۔ میں یہاں آ کر طویل بوریت کے لیے ترس گیا ہوں۔ اسی بوریت میں تو میری اپنے آپ سے ملاقات ہوتی ہے۔

جو لوگ بور نہیں ہوتے، وہ کیا کرتے ہیں (سیدھی سی بات ہے کہ کمال کرتے ہیں!) میں اخباروں کے آخر میں وہ صفحے ضرور دیکھ لیتا ہوں جہاں فراوانی اور تنوع بازار کی جنس ہے۔ جنس کے عمل میں تو سیدھے سبھاؤ طلب اور رسد کا معاملہ ہے لیکن ایک نظر کے بعد دوسری نظر کی خواہش عجب ہے۔ میں نے یہ اشتہار کاٹ کر رکھ لیے ہیں۔ اگر پاکستان میں یہ رواج ہوتا تو میں سارے وقت اخباروں میں اپنے لیے ضرورتِ رشتہ کے ایسے اشتہار ہی دیے جاتا کہ ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔

میں جلدی واپس چلا جاؤں گا، میں نے ارادہ باندھ لیا ہے۔ امریکا کا ویزا یہاں سے لینے میں قباحت ہے۔ سفارت خانے میں اپوائنٹ منٹ ہی اتنی دیر کا مل رہا ہے کہ اس کے انتظار میں کب تک بیٹھا رہوں؟ اس لیے نیویارک کا عزمِ سفر ملتوی۔ اب میں گھر جاؤں گا، اپنے موسمِ خزاں کی طرف۔

مگر گھر جانے سے پہلے یہ سارے کام نمٹانے ہیں۔ میڈیکل ٹیسٹ کا مرحلہ۔ آج صبح خون دینے اسپتال گیا۔ کل رات نو بجے سے کھانا پینا بند کر دیا تھا۔ ٹیسٹ میں خاصا وقت لگ گیا۔ اسپتال میں وہ کمرا ڈھونڈنا، پھر باری آنے کا انتظار کرنا...ایک ہی خاتون ریسپشن پر بھی تھیں اور وہی خون بھی لے رہی تھیں۔ باری آنے پر میں cubicle کے اندر چلا گیا اور آستین کھول کر ہاتھ آگے کر دیا۔ میری مٹھی میں لکڑی کی گیند پکڑائی ہوئی تھی۔ رگیں تن گئیں۔ پھر رگوں میں سوئی اترنے کی چبھن ... میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔ وہی چبھن کی تکلیف جس سے میں اب تک مانوس ہوگیا ہوں۔ میں خواہ مخواہ گھبرا رہا تھا کہ اجنبی ملک ہے اور کیا ہوگا...وہی رگوں کا تناؤ اور خون میں سوئی کا سفر... ایک آدمی ریسپشن پر بیٹھی ہوئی اس عورت پر چیخ رہا ہے کہ میرا نام غلط کیوں پکارا... میرے نام کا تلفظ یہ نہیں ہے۔ وہ عورت جواب نہیں دے پا رہی۔

نام تو اس نے میرا بھی غلط پکارا تھا۔ مگر مجھے خود اس عورت کے نام سے دلچسپی ہوگئی۔ میں اس کو چینی سمجھا تھا مگر وہ لاطینی تھی، بولتے ہی پتا چل گیا تھا۔ اس نے بیج لگا رکھا تھا جس پر اس کا نام درج تھا... پاز۔

ٹیسٹ کے ہوتے ہوتے تک بھوک سے برا حال ہوگیا۔ اس کے بعد ناشتے کے لیے ''ٹم ہورٹن'' کے فاسٹ فوڈ ریستوران میں گھس جاتے ہیں۔ میں بیگل کے اوپر کریم لگا کر کھاتا ہوں۔ بیگل خستہ ہے ورنہ تو اس وقت بھوک میں کواڑ بھی پاپڑ ہوجاتے۔

ڈاکٹر کا اپائنٹ منٹ بھی کس جتن سے ملا تھا۔ وہ بھی منیر صاحب کے ذاتی حوالے سے۔ ورنہ ان کے سسٹم سے جاتے تو ہفتوں لگ جاتے۔ ڈاکٹر بھی ملا تو کچنر، واٹرلو میں۔ چلنے لگے تو پتا چلا کہ یہ تو اگلا ہی شہر ہے، دو ڈھائی گھنٹے کی مزید مسافت۔ شہر سے نکلتے ہی کھلی فضا، ہرے بھرے میدان، درختوں کے رنگ بدلتے پتے، ہائی وے پر ہدایات کے نشان (یہاں تو کوئی راستہ بھی نہیں بھول سکتا) میں پھر بھی گھبرا رہا ہوں کہ راستے کے منظر سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹر کے دفتر میں ہدایت ناموں چارٹس اور نقشوں کے درمیان ایک مختلف رسم الخط میں چھپی ہوئی ہدایات۔ میں اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھتا ہوں، کیا آپ گجراتی ہیں؟

یہ پنجابی ہے، اس لیے کہ میرے بہت سارے مریض صرف یہی پڑھ سکتے ہیں۔ اس علاقے میں سکھ بہت ہیں۔ ویسے میں حیدر آبادی ہوں، ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں۔
وہ میرا معائنہ کرتے ہیں، رپورٹس دیکھتے ہیں (نئی رپورٹ کی ایک کاپی میں مانگ لیتا ہوں۔)
''آپ کو اندازہ ہے ناں کہ آپ کا پرابلم کیا ہے؟'' وہ تصدیق کرتے ہیں۔ میں سر ہلاتا ہوں۔
''آپ کے ساتھ آئندہ یہ ہونا ہے۔'' وہ صاف انداز میں کہتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ باقی سب حالات بدستور رہے، تو مجھے کس طرح مرنا ہے۔ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔
مگر میں اس پیش اندیشگی کو اپنا راستہ خراب نہیں کرنے دینا چاہتا۔ ہم واٹرلو سے نکل کر اسٹریٹ فورڈ جا رہے ہیں۔ راستہ بے حد حسین ہے مگر اسٹریٹ فورڈ کا شہر اس سے بھی زیادہ۔ صاف راستے، چھوٹے چھوٹے انگریزی وضع کے کاٹیج، دریا کا کنارہ، پانی کے قرب سے ساری فضا نم، سکون سے تیرتی ہوئی بطخیں، دریا کے کنارے روشوں پر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے جوڑے۔ سارا منظر یوں لگتا ہے کہ کسی فلم کے پس منظر سے آیا ہے اور آن کی آن میں غائب ہو جائے گا۔ میں اس حسن کو اپنے پاس کیسے محفوظ رکھوں؟ تھوڑی سی یاد بنا لیتا ہوں۔

اور جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، اسٹریٹ فورڈ کے وسط میں شیکسپیر۔۔ آج ہیملٹ دکھایا جا رہا ہے۔ ہم ٹکٹ کی قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ابھی پردہ اٹھنے میں دیر ہے۔ تھیٹر کی دکان میں مٹرگشتی۔ ٹی شرٹ اور فاؤنٹین پین سے لے کر کوسٹر اور ٹائی تک ہر چیز پر شیکسپیر کی شبیہہ۔ ٹریڈ مارک ہی کیوں نہ ہو، یہاں شیکسپیر ایک زندہ ثقافتی وجود محسوس ہوتا ہے۔
ادبی طور پر اس سے بھی زیادہ زندہ۔ ڈرامے کے تعارفی کتابچے میں لکھا ہے:

The Ghost of the play haunts our culture.

میں پہلی دفعہ ہیملٹ کو اسٹیج پر دیکھ رہا ہوں۔ سیکڑوں دفعہ کے پڑھے ہوئے الفاظ زندہ ہو کر سامنے آرہے ہیں۔ ایکٹروں کی مہارت اور سیٹنگ کا فوری تاثر ذرا ماند پڑا تو اس ڈرامے

نے مجھے ایک بار پھر un-nerve کردیا۔ باپ کی روح سے مکالمے نے مجھے پھر سہا دیا۔ لیکن ماں سے گفتگو والے سین نے تو جیسے میرے اندر بلوہ کردیا۔ پھر چاقو چلنے لگے۔ کراچی سے روانگی سے پہلے کے وہ تکلیف دہ لمحے یاد آنے لگے...

No, I am not prince Hamlet, nor was meant to be.....

اسٹریٹ فورڈ میں کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان (''انڈی پنڈنٹ اسٹور'' جواب غائب ہوتے جارہے ہیں کیوں کہ زنجیر دار اسٹورز ان کو نگلتے جارہے ہیں) اور ایک چھوٹا سا کیفے جس کا نام بالزاک کے نام پر ہے اور انداز پیرس کی وضع کا... پھر رات گئے واپسی کا سفر۔ میں ہوں، رات کا ایک بجا ہے۔ خالی سناٹا بول رہا ہے۔ سنسان سڑک، چاندنی میں نہائے ہوئے کھیت اور گھاس کے قطعے۔ ٹرکوں کی روشنی کے نیم دائرے جو جلد ہی دوسرے رخ پر بکھر جاتے ہیں۔ تیز رفتار...

انتظار صاحب نے لکھا تھا کہ میں غدر کے ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی ہوں۔ اس وقت وہ اور میں میک ڈونلڈ کے ریستوران میں رات گئے کے آخری گاہک ہیں، جب تیز نیون لائٹس بجھ رہی ہیں اور دکان سمٹ رہی ہے۔ انتظار صاحب اپنی وہی مخصوص نیلی اونی ٹوپی پہنے بیٹھے ہیں اور برگر کھا رہے ہیں۔

انتظار صاحب کو یہاں کے رنگ برنگ کھانے کچھ زیادہ پسند نہیں آئے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ دیسی کھانا کھائیں۔ میں بہت ضد کرکے انھیں ایک یونانی ہوٹل میں لے جاتا ہوں۔ خالد سہیل اور جاوید دانش ہمارے ساتھ ہیں۔ کھانا خالد سہیل منتخب کرتے ہیں کہ وہ یہاں کے کھانوں سے خوب واقف ہیں۔ جاوید دانش تھیٹر کی بات کررہے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اتنے اصرار سے یہاں آئے اور یہ تجربہ بالکل ہی ناکام رہا۔ انتظار صاحب یہاں آتے ہوئے ارسطو، سقراط، ہومر اور اوڈیسی کے نام لے رہے تھے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ اب میری سمجھ میں آگیا کہ سقراط نے زہر کا پیالہ کیوں پی لیا تھا؟ ایسے کھانے سے بچنے کے لیے تو کوئی بھی ایسا کرسکتا ہے۔

جاوید دانش اور خالد سہیل ہمیں ''چیپٹرز'' کی کافی شاپ میں ملے۔ یہ کتابوں کی ''چین اسٹور'' ہے، شہر میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ کتابوں کا اچھا ڈسپلے اور ہر دکان کے ساتھ کافی شاپ۔ ہم ایسے لوگوں کے لیے جو کتابیں خریدنے سے زیادہ browse کرنے کے عادی ہیں، یہ نہایت عمدہ جگہ ہے۔

یہاں چائے بہت ہلکی پینے کا رواج ہے۔ میں کافی کو ترجیح دیتا ہوں اور پھر کافی شاپس... ''سیکنڈ کپ'' کی یہ دکان مسی ساگا کے شاپنگ مال میں ہے، یہاں چائے اور کافی کا وہ تنوع ہے کہ آدمی کیا انتخاب کرے اور کیا چھوڑ دے۔ دکانوں کا بھی وہی عالم ہے۔ سامان سے بھری ہوئی، دعوت دیتی ہوئی۔ یہ پھیرا میں نے ڈالر اسٹور سے شروع کیا اور اسی پر ختم کیا۔ اپنی اوقات اور اپنی وہی ٹکے گز کی چال...

ہمارے میزبان کے ایک واقف کار کے جوان بچے کا انتقال ہوگیا۔ نمازِ جنازہ میں ہم بھی جاتے ہیں جہاں بہت سے پاکستانی ملتے ہیں۔ یہاں کے ایک مشہور ادیب اور ادبی میزبان بھی شامل ہیں جو ہم سے کچھ کٹے کٹے سے، کھنچے کھنچے سے ہیں اس لیے کہ ہمیں ان کے حریف گروہ نے یہاں بُلایا ہے۔

ہمارے لیے یہ معاملہ مشکل ہے۔ چھوٹی سی ادبی برادری میں رقابتیں ایسی کہ باہر سے آنے والے کو اندازہ کرنا مشکل اور نہ جانتے ہوئے بھی اس میں شامل ہوجاتا ہے۔ یہاں گروہ بندی بھی ہے اور کسی ایک شخص کی اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش بھی۔ کراچی کی ادبی ٹولیوں کی طرح یہاں بھی معاملہ power اور اقتدار کا ہے، یہاں ادبی حلقوں کے ذریعے سے ''کمیونٹی'' میں نمایاں ہونے کی کوشش بھی ہے۔ یہ گروہ بندی اردو والوں کا مقدر بن گئی ہے۔ ایک ویران جزیرے پر Shipwreck ہو کر تین چار ادیب جا پہنچیں تو فوراً تین چار انجمنیں بنا لیں گے اور فی الفور اپنے اپنے مشاعرے کا ڈول ڈال کر شاعروں کو بلانے لگیں گے، ''جشن'' منانے لگیں گے جو شعر و ادب سے زیادہ ''تعلقاتِ عامہ'' کی نمائش ہوتے ہیں۔

ضمیر احمد صاحب کے ہاں کھانا اور کرنل انور احمد کے ہاں صبح کا ناشتا۔ ادبی لوگوں سے ملاقاتیں۔ ان لوگوں کی وجہ سے یہاں ادبی رونقیں ہیں۔ خالد سہیل ہیں، بیدار بخت ہیں جو پڑھتے زیادہ ہیں اور ادبی سیاست سے دور رہتے ہیں۔ حفظ الکبیر قریشی صاحب عزیز احمد کے زمانے سے یہاں ہیں، اشفاق حسین ہیں، رشید صدیقی، عابد جعفری، کرامت غوری اور ان کی بیگم بھی اپنی سرکاری ملازمت کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی رخصت لے کر یہاں آگئے ہیں۔ اکرام بریلوی پرانے چاول ہیں، برابر لکھ رہے ہیں۔ نسیم سید ہیں۔ نزہت صدیقی شعر کہتی ہیں۔ عرفان عُرفی ہیں، جو شاعری سے افسانے کی طرف آگئے۔ زہرہ زبیری سے تعارف ہوا کہ کہانیاں لکھتی ہیں۔ جاوید دانش ہیں۔ فیصل فارانی نوجوان ادیب ہیں اور افسانے لکھ رہے ہیں ان کے افسانوں میں ایک کچی کچی تازگی ہے۔ رشید ندیم اردو اور پنجابی میں شعر کہتے ہیں۔ رائٹرز فورم کے تیس چالیس باضابطہ ممبر ہیں۔ غرض خوب لوگ ہیں۔

مگر بعض لوگ ایک Time-warp میں زندہ ہیں۔ شیشے کے بلبلوں میں قید۔ اپنی یادوں کے خزانوں کی مستقل نمائش پر مجبور۔ پرانی محفلوں کی خاک آنکھوں میں سجائے بیٹھے ہیں۔ نئے آنے والوں کو بلاتے ہیں کہ ان کو دکھانے کے بہانے یہ خزانے پھر سے باہر نکالیں، یادیں تازہ کریں...

ڈین فورتھ اسٹریٹ پر یونانی علاقے سے ملا ہوا افغانی علاقہ ہے۔ حلال گوشت کی دکانیں، اسٹورز، ہوٹل۔ ہم نے "چوپان کباب" میں کھانا کھایا۔ ایرانی، افغانی کھانے فوراً مختلف محسوس ہوتے ہیں۔ ان پھیکے کھانوں نے ہندوستان میں پہنچ کر کیا ذائقہ پایا (شاید میں اس کو اس لیے اچھا کہہ رہا ہوں کہ یہ ذائقہ مانوس ہے۔ مانوس ہی بہتر ہے) میں اس معاملے میں انتظار صاحب کا قائل نہیں۔

رائل اسٹن تھیٹر میں میکا ٹھکر کا ڈانس ڈراما۔ ہندوستانی کے علاقہ افریقی / غرب الہندی اور جاپانی روایتوں کو ملا کر ٹیگور کی کہانی Land of Cards کو تمثیل بنانے کی کوشش۔

fusion کا یہ انداز... con کے بغیر... یہاں بہت مقبول ہے، کھانوں تک میں یہ فیوژن برپا کیا جاتا ہے)۔ مہمانوں میں جارج فرنانڈس بھی ہیں جو اس وقت ہندوستان کے وزیر دفاع ہیں۔ سادہ سے ہیں اور اس پھنّے خانی، طمطراق اور fanfare کے بغیر ہیں جو پاکستان کا معمولی سے معمولی سرکاری اہل کار اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ بیدار بخت نے تعارف کرایا۔ میں نے ہاتھ ملایا یہ سوچ کر کہ یہ زندہ تاریخ ہیں، ایک Living legend۔ حالاں کہ میں نے ان کے حالیہ بیانات کا کچھ ایسا مداح نہیں ہوں۔

ٹورنٹو کے ریلوے اسٹیشن کے باتھ روم میں ایک شخص مجھے بڑبڑا دیتا ہے May you find your way to heaven، وہ کہتا ہے، .The lord is about to come یہ تو جنت کی بشارت دے رہا ہے، میں سمجھا تھا کہ Mugging کر کے پیسے چھیننے آ رہا ہے۔ میں نے اپنا سوٹ کیس مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

میں ریل سے ونڈزر جا رہا ہوں۔ گنگناتا ہوا مسرور جا رہا تھا۔ جانے کہاں سے جے پور جا رہا تھا، جانے کیا اور وغیرہ وغیرہ۔

سفر اتنا طویل اور اتنا آرام دہ ہے کہ میں اونگھ بھی لیتا ہوں، کچھ دیر کتاب پڑھتا ہوں اور کچھ دیر اس نوٹ بک کو لے کر بھی بیٹھتا ہوں۔

ہندوستانی صورت کا ایک ٹکٹ چیکر، سرکاری وردی پہنے ہوئے، جتنی بار یہاں سے گزرا مجھے دیکھ کر مسکراتا ہے اور سر کے اشارے سے سلام کرتا ہے۔ اس لیے کہ میں نے گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے اس سے پوچھا تھا کہ کوچ کون سی ہے اور کیا میں، جہاں میری مرضی ہے بیٹھ جاؤں؟ بھئی ہم ایسی خالی ریلوں کے کہاں عادی ہیں۔

وہ اب کی بار گزرتا ہے تو کاندھے کے اوپر سے مجھے لکھتا ہوا دیکھ کر جاتے جاتے ایک بار پھر مجھے مڑ کر دیکھتا ہے۔ اب میں سمجھ جاتا ہوں۔ اس کے لیے یہ سیدھے ہاتھ سے الٹے کی

طرف لکھنا حیرت کی بات ہے۔

میری نوٹ بک تو اسی سمت چلتی ہے۔ مشرق سے مغرب کی طرف۔ اب کون سا اسٹیشن آنے والا ہے؟

اگلا اسٹیشن لندن نام کا شہر ہے۔ جس میں چاروں طرف خزاں کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ رنگوں کی کائنات میں ایک اور شہر۔

آگے کی سیٹ کی جیب میں تصویروں والا سفری رسالہ رکھا ہے۔ میں اس کے ورق الٹ رہا ہوں۔ !Welcome Aboard والے نوٹ میں لکھا ہے:

Fall is the season of change. Changes in routines. Changes in colour. A season full of fresh faces and new challenges. Back to school and back from the beach, fall seizes us with a re-charged need to get things done. It is the time of the year when we hit the books, start new projects and go back to the drawing board.

میری خزاں کی نوٹ بک کا سرنامہ!

کراچی کے ایک مصوّر جو مجھے یہاں دیکھ کر ملتے ہیں اور مسکراتے ہیں، اچھا، تم بھی یہاں آ گئے ہو؟ میں ۲۴ رکو واپس کراچی جا رہا ہوں، آج ہی سیٹ کنفرم ہوئی ہے، میں انھیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔

لندن اور نیو یارک کے بعد انگریزی دنیا کا سب سے بڑا ثقافتی مرکز ہے یہ شہر۔ شمالی امریکا کا سب سے زیادہ live-able city، وہ مجھے باور کرانے لگتے ہیں۔

مجھے ان کی ہر بات سے اتفاق ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں بھی رہ پڑوں ''ٹورآنو'' میں... اس کے باشندوں کا مخصوص تلفظ، نام کا آخری حصہ کھینچ کر Drawl میں...

میں نے سوال ہی غلط سمجھا تھا۔ ٹو بی آر ناٹ ٹو بی والا سوال ٹورنٹو میں یوں پوچھا جاتا

ہے... ٹو کم ہیئر آر ناٹ ٹو کم ہیئر۔

جتنے پاکستانی ملتے ہیں، ان میں سے بیش تر ایک طرح کی مبارک باد والی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہیں۔ اچھا تو آپ یہاں آگئے؟ چلیے اچھا ہوا۔

کراچی یونی ورسٹی کے ایک ریٹائرڈ پروفیسر جو مجھے ونڈزر میں ملتے ہیں تو بہت بوڑھے لگتے ہیں... مگر صرف چہرے سے، پاٹ دار آواز اسی طرح کراری ہے... اور وہ مجھ سے ابو کی خیریت پوچھتے ہیں، ''تو ڈاکٹر صاحب ٹھیک ہیں؟ مائی گریٹ کر کے کب آرہے ہیں؟''

''وہ تو ۷۴ء میں مائیگریٹ کر کے آگئے تھے۔'' میں بڑبڑاتا ہوں۔

''ارے بھئی یہاں کب آرہے ہیں آپ لوگ؟'' وہ میری کوڑھ مغزی پر مجھے ڈانٹ دیتے ہیں۔

کوفت مجھے اس بات پر ہوتی ہے کہ ان سب کے لیے مسئلہ بس یہی ہے کہ کب آنا ہے۔ یہ نہیں کہ آنا ہے تو کیوں آنا۔

واہ صاحب، آنا ہے تو کیا آنا، جانا ہے تو کیا جانا۔ میں تو واپس جارہا ہوں۔ میں ابھی نہیں آرہا۔

اب وہ مجھے خلوص اور اپنائیت کے ساتھ سمجھائے جارہے ہیں کہ جس طرح ایک بزرگ کو سمجھانا چاہیے۔ ''بھئی آپ کے اس ایک Fall-back option ہونا چاہیے۔ وہاں خدانخواستہ کچھ ہوجائے تو کوئی جائے امان تو ہو... اپنا نہیں تو اپنے بچوں کا سوچیے...''

میں ان کو، کسی کو، اپنا یہ خواب ناک احساس نہیں بتاتا کہ جب چند سال پہلے کراچی میں ہنگامے عروج پر تھے، میں نے سوچا تھا کہ جس شہر میں اتنے ہزاروں آدمی مارے جارہے ہیں اس میں اخلاقاً مجھے بھی مرجانا چاہیے بغیر کسی افسوس کے... تیشے بنا مرنہ سکا۔ سرگشتۂ خمارِ رسم و قیود تھا۔

مگر میں ان کی گفتگو کے دائرے میں واپس آگیا ہوں۔ وہ زور شور سے کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے دس سال پہلے ایک میمورانڈم لکھا تھا کہ جلد ہی کراچی یونی ورسٹی کے سوشل سائنسز کے شعبے تباہ ہوجائیں گے اس لیے کہ جو جگہیں خالی ہوں گی ان کو پر کرنے والے نہیں ہیں۔

میں ان کو بتاتا ہوں کہ میں نے لڑکپن میں یہ عمل بہت نزدیک سے دیکھا ہے کہ ایسے لوگوں کو تیار نہیں کیا گیا، ان کا راستہ باقاعدہ روکا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ یونی ورسٹی قحط الرجال کا شکار ہوگئی، شہر کی علمی، سماجی زندگی میں کسی قسم کی سمت نمائی کا معنی خیز کردار ادا نہیں کرسکی۔ شہری ادارے ایک ایک کرکے تباہ ہوئے۔ یہ ہماری پچھلے دس، بیس سال کی کارکردگی کی رپورٹ ہے۔

ونڈزز کے قابل دید مقامات میں کیسینو ہے، ''اپنے پہ بھروسا ہے تو داؤ لگالے'' ٹائپ کا۔ ایڈلٹ انٹرٹینمنٹ کی دکانیں ہیں، شاپنگ مال ہے۔ امیگرنٹز یہاں بھی خاصے ہیں۔ وہ سامنے جھیل کا کنارہ ہے جس کے دوسری طرف نیلی، سرمئی شیشہ جڑی عمارتیں امریکا۔ یعنی ساحل مراد۔ جھیل کے نیچے سے سرنگ جاتی ہے اور اس شہر سے ہزاروں لوگ کام کرنے ساحل کے اس پار جاتے ہیں۔ ان میں سلمان بھی ہیں۔

کتابوں کی جستجو کا اصل مزہ تو پرانی کتابوں کی دکان میں آتا ہے۔ ہر کتاب جو نظر آجائے، دریافت ہے۔ ''چیپٹرز'' کا حال مجھے بے شک پسند ہے لیکن جو کتابیں اس میں نظر آئیں گی وہ تھوک کے بھاؤ خریدی گئی ہوں گی اور ایک سی ترتیب کے ساتھ اس زنجیر وار سلسلے کے ہر اسٹور میں رکھ دی گئی ہوں گی، ٹوتھ پیسٹ کے ٹیوب اور صابن کے ڈبے کی طرح۔ یہ دکانیں یوں بھی ''صارفین'' کے لیے ہیں۔ شہر کی ایک اہم سڑک پر اس چھوٹی سی دکان میں گھستے ہی کتابوں کی خوش بو اور دوستی کا ماحول۔ حصے بنا کر موضوعات کے مطابق کتابیں ترتیب دے کر رکھی گئی ہیں مگر اس کے باوجود وہ الماریوں سے نکلی پڑ رہی ہیں، فرش پر ڈھیر ہیں، اس طرح بکھری ہوئی ہیں کہ اپنی تلاش اور دریافت کی دعوت دیتی ہیں۔ پھر ان میں بعض کتابیں حیرت کا سامان بھی پہنچاتی ہیں۔ ارے، رافائل البرٹی کی نظموں کا مجموعہ اور وہ بھی مارک اسٹرینڈ کے ترجمے میں؟ افوہ، پتلی سی کتاب کی قیمت بھی نئی کے برابر ہے۔ یہاں پال اوسٹر کے کئی ناول رکھے ہوئے ہیں، اچھا، اس کی یہ بھی کتاب ہے۔ اوہو، مارگریٹ ایٹ وڈ کی ''بقا''

(Survival) اتنے سستے داموں؟ یہ اصل بقا ہے۔

آج یہاں دن ٹھنڈا ہے۔ میں صبح باہر نکلا تو میرے کان میں درد کی ٹیس اٹھی۔ جھیل کے دوسری طرف، ڈیٹرائٹ کی اونچی عمارتیں کہرے میں لپٹی ہوئی ہیں۔ نیلا اور سرمئی شہر...

گھر فون کیا،، سیمیں سے اور بچوں سے بات کی۔ ان سے بات کرنے سے ہوم سکنس اور بڑھ گئی۔ اڑنے چگنے میں دن گزارا۔ پہنچوں کس طرح آشیاں تک۔ مجھے وہ دن یاد آیا جب بوسٹن میں پڑھنے کے لیے تازہ وارد ہوئے تھے اور پہلے ویک اینڈ پر بوسٹن کامن گئے تھے۔ وہاں کی رونق اور باغ کی کیفیت دیکھ کر میں نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ سوچا تھا، اب یہاں ایک سال گزارنا ہی گزارنا ہے۔ واپسی کا راستہ بند۔

میں تو واپس جاؤں گا، وہ نہیں واپس جاسکتے۔

وہ سب سے یہی کہہ رہے ہیں کہ دسمبر کے پہلے ہفتے میں ڈاکٹر سے چیک اپ کرالوں، وہ فیصلہ کرے گا کہ آپریشن ہونا ہے کہ نہیں۔ پھر جنوری، فروری میں جاؤں گا۔

مگر وہ یہ سفر اکیلے نہیں طے کر سکتے۔ شاید اصل میں ان کو بھی اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ اتنے کم زور ہوگئے ہیں کہ کراچی کے سفر کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ پسند آئے یا نہ آئے، انھیں اب یہیں رہنا ہے اور یہیں کسی نہ کسی طرح وقت گزرنا ہے۔ وہ جن لوگوں کی خیریت پوچھ رہے ہیں اور جن بچوں کے لیے چاکلیٹ بھیج رہے ہیں، انھیں دوبارہ کیا دیکھ پائیں گے؟

یہاں چھوٹے شہر میں پاکستانی میاں بیوی۔ دن بھر نوکری کرتے ہیں، شام کو ٹی وی کے سامنے ڈھیر ہوکر ''Sit-com'' دیکھتے ہیں۔ مسئلہ ویک اینڈ کا ہے۔

وہ مجھے خداحافظ کہنے کے لیے آئے۔ میں ان سے ہاتھ ملا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے ان سے کہا، گیراج میں نہ کھڑے رہیں، سردی لگ جائے گی۔ گاڑی گیراج سے باہر نکلنے لگی۔ وہ ہاتھ ہلاتے رہے۔ گاڑی باہر آگئی اور گیراج کا خودکار دروازہ... لکڑی میں اسٹیل لگی

ہوئی ہے... اوپر کی طرف سے بند ہونے لگا۔ وہ وہیں کھڑے تھے اور نیچے آتے ہوئے دروازے کے پیچھے ٹکڑے ٹکڑے اوجھل ہوتے جا رہے تھے۔ پھر مجھے ان کی جگہ صرف دروازے کے تختے ہی نظر آ رہے تھے۔ گاڑی اگلا موڑ مڑ گئی۔

میں ریل سے واپس ٹورنٹو آ رہا ہوں۔ کھڑکی کے باہر سارا منظر صبح تڑکے کے ملگجے اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ اندھیرا دھیرے دھیرے چھٹتا ہے اور خزاں کے رنگوں میں ملبوس درخت، شاداب اور فرحاں، ابھرتے چلے آتے ہیں۔

یہ بہت جانی پہچانی، دور سے پاس سے آتی ہوئی آواز ریل کی سیٹی ہے، چھوٹے سے شہر میں سڑک پر پھاٹک بند ہے کہ ریل گزر جائے، اسکول کے بچوں کی زرد وین رکی ہوئی ہے۔

اس شہر کی سڑکیں پیلے پتوں سے اٹی ہوئی ہیں اور جو گاڑیاں مکانوں کے سامنے کھڑی ہوئی ہیں، ان پر بھی پیلے پتے پڑے ہوئے ہیں۔ ریل کے پل کے نیچے سے۔ جھلکنے والا یہ شہر پھر یوں ہی غائب ہو جاتا ہے۔ میں کافی کا کپ رکھ دیتا ہوں۔ میرے برابر کا مسافر سو رہا ہے اور مجھے پیشاب کرنے کے لیے جانا ہے۔ کیا اس کو پھلانگ کر جاؤں؟ وہ اپنے کانوں میں سی ڈی لگا کر سو گیا ہے۔ اس ٹرین میں مسافر بہت ہیں، خالی جگہ کم۔

ٹورنٹو کے اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے پال اوسٹر کا ناول ختم ہو رہا ہے۔ گاڑی شہر کی حدود میں داخل ہو گئی اور ناول کی کہانی بھی آخری صفحوں میں سمٹتی جا رہی ہے۔ گاڑی رکنے سے پہلے ناول ختم ہو جائے۔

ٹورنٹو شہر آ گیا۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر چاروں طرف دیکھ رہا ہوں۔ سی این این ٹاور کا اوپری حصہ دُھند میں ڈھکا ہوا ہے۔ ہوا خنک ہے، دھوپ غائب۔ میں سمٹا سکڑا، گاڑی کے انتظار میں سڑک کے کونے پر کھڑا ہوا ہوں۔

ٹورنٹو... گاڑی کسی سگنل پر رکتی ہے اور برابر کی گاڑی میں سے کوئی دیسی سا چہرا اچانک

نظر آجائے تو وہ بھی ہمیں نگاہ بھر کر غور سے دیکھتا ہے پھر جلدی سے نگاہیں پھیر لیتا ہے۔ کتنے
بہت سے مانوس سے چہرے ٹیکسی چلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

نور جہاں عزیز اور معیز وسن جی کے ساتھ لنچ۔ یہ صرف Minority Culture کے
نمائندے نہیں ہیں۔ مشرقی افریقا سے تعلق رکھنے والے اسماعیلی مسلمان۔ نور جہاں عزیز، اہم
ادبی جریدے ٹورنٹو ریویو کی منتظمہ ہیں۔ وسن جی نامور ناول نگار۔ نور جہاں سے پچھلی مرتبہ
ٹورنٹو میں ملاقات ہوئی تھی جس کے بعد انھوں نے میرا ایک ترجمہ اپنے رسالے میں چھاپا تھا۔
وسن جی لاہور آئے تھے تو میں نے ''نیوز لائن'' کے لیے ان کا انٹرویو کیا، جس کے لیے لگے
ہاتھوں ان کے ناول بھی پڑھ ڈالے تھے۔

کھانا اچھا تھا، گفتگو عمومی۔ منیر صاحب نے ہاربر فرنٹ کے ''جشنِ مصنفین'' میں پاکستانی
ادیبوں کی شرکت کا سوال اٹھانے کے لیے ان سے تعاون مانگا۔ میں نے ان کے اشاعتی پروگرام
کا پوچھا۔ ان کے رسالے میں پاکستانی ادیب، شاعر بہت کم شائع ہوئے ہیں۔ پاکستانی ادب کی
آواز اپنے دائرے کے باہر بہت کم پہنچتی ہے۔ ہمیں ''جشن'' منانے سے ہی فرصت نہیں۔

وسن جی نے بتایا کہ جب وہ کینیڈا کے گورنر جنرل کے ساتھ پاکستان کے سرکاری
دورے پر آیا تھا تو اس نے محسوس کیا کہ تمام تر سرکاری تقریبات میں اس کا کوئی خاص نوٹس ہی
نہیں لیا جاتا تھا، ساری آؤ بھگت دوسرے مہمانوں کی ہوتی تھی۔ یہ یقیناً رنگ کا تعصب ہے۔
ہم لوگ بھلا ایک کالے کینیڈین کو کیا گھاس ڈالیں گے؟ نئی کتابوں میں نور جہاں نے ایک ایرانی
خاتون کے افسانوں کا مجموعہ چھاپا ہے۔ اس کی تعریف کر رہی تھیں۔ میں نے ''پہلی اقوام'' کے
ادب کے بارے میں پوچھا کہ اچھی انتھولوجی کون سی ہے؟ اس کے بارے میں ان کو زیادہ پتا
نہیں تھا۔ اب یہ انتھولوجی خود ہی تلاش کرنی پڑے گی۔ ان لوگوں کی دلچسپی کا محور، نئے امیگرنٹس
کی تحریریں زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے کیٹلاگ میں شاعری کی ایک کتاب کا نام خوب ہے:

Pappaji wrote poetry in a language I cannot read

ہم شہزاد عالم سے ملنے دوبارہ گئے اور ان کے گھر پر خاصا وقت گزارا۔ یہ جس عمارت میں رہتی ہیں، اس میں تمام فلیٹ آرٹسٹ لوگوں ہی کے لیے ہیں اور اسٹوڈیو بھی بنا ہوا ہے۔ شہری انتظامیہ کی قدر شناسی فن کا معمولی سا نمونہ۔ ہم اپنے یہاں تو ان سہولتوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔

فن پاروں، تصویروں سے سجا ہوا گھر۔ دیواروں پر ظہور الاخلاق اور جہاں آرا اخلاق کی تصویریں اب بھی ہشاش بشاش ہیں۔ ظہور الاخلاق کی مصوری پاکستان میں تجریدی آرٹ کا روشن باب ہے تو ان کی موت، اس ملک کی ثقافتی تاریخ کا بدنما دھبہ۔ کیا تصویریں ماتم میں سیاہ پوش ہو جائیں؟

شہزاد اس بار بھی بڑے تپاک سے ملیں۔ الائچی کی چائے پلائی جس میں گلاب کی کلیاں پڑی ہوئی تھیں۔ چائے کی مہک گلاب میں بسی ہوئی تھی۔

انتظار صاحب سے ان کی لاہور کی پرانی ملاقات ہے۔ ان کو دیکھ کر بچھی جا رہی تھیں۔ اس بات پر بار بار خوشی کا اظہار کر رہی تھیں کہ وہ ان کے گھر آئے ہیں۔ مجھ سے کہنے لگیں کہ آپ کتنے خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اتنے بڑے ادیب کے ساتھ سفر کرنے کا موقع ملا ہے۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ اس کے بارے میں لکھیں گے؟

یہ سوال تو میں خود اپنے آپ سے کر رہا ہوں۔

میں نے ان کو بتایا کہ پچھلی بار ٹورنٹو آیا تھا تو ان کی بیٹی سے ملاقات ہوئی تھی۔ برجو مہاراج کے رقص کا پروگرام تھا، جہاں آرا اس میں آئی ہوئی تھی۔ منیر صاحب نے تعارف کرایا تھا۔

شہزاد نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے ورنہ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس سانحے کے بعد بکھر کر رہ جاتا۔ یہ تو خیر ان کا انفرادی مسئلہ ہے لیکن عشق اور فن کے ان دو پیکروں کا یہ انجام، ہمارے معاشرے کے اجتماعی چہرے کا بھیانک اور مکروہ رخ۔ شہزاد پوری تن دہی سے اس پروجیکٹ میں جت گئی ہیں کہ اپنے شوہر کے بارے میں ایک یادگاری کتاب شائع کی جائے، پاکستان میں فن مصوری کے بارے میں کام کیا جائے۔ یہ باتصویر کتاب دسمبر میں launch ہوگی۔

شہزاد کے گھر مہمان آئی ہوئی خاتون، ہیمانی بیزجی... ہورک یونی ورسٹی میں سوشیالوجی پڑھاتی ہیں، ادب کا گہرا مطالعہ ہے۔ بنگلہ ناری ہیں۔ ہمیں بنگلہ ادیب اختر الزماں الیاس کے بارے میں بتاتی ہیں جس کے ناول ''خواب نامہ'' کا وہ انگریزی میں ترجمہ کر رہی ہیں۔ پھر وہ ذکر کرتی ہیں قرۃ العین حیدر کا... ''آگ کا دریا'' کا بنگلہ ترجمہ بہت خوب صورت ہے، انگریزی میں اس کا بیڑا غرق کر دیا ہے، وہ کہتی ہیں۔ ''اس کا انداز بالکل Comic script جیسا ہے۔''

پھر وہ قرۃ العین حیدر سے اپنی دو چار ملاقاتوں کا احوال سناتی ہیں جس کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی کتابیں ہی پڑھ لینا کافی ہے۔ ایک ملاقات میں ہیمانی نے عصمت چغتائی کی تعریف کی تو انھوں نے کہا کہ She was a heartless woman اور قصہ سنایا کہ عصمت چغتائی کو شام کے وقت solitaire کھیلنے کی عادت تھی۔ ان کے شوہر نے کہا کہ ان کے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ انھوں نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا کہ ہاضمے کی دوا پی لو۔ وہ تاش کھیلتی رہیں، ان کے شوہر اس عرصے میں انتقال کر گئے۔

ہیمانی، ان کے روّیے اور ان کے حُلیے کا دلچسپ احوال سناتی رہیں اور ہم توجہ سے سنتے رہے۔

ضمیر احمد صاحب سے تفصیلی ملاقات۔ قمر جمیل اور محبوب خزاں کے دوست ہیں، ان کا تذکرہ برابر کرتے رہے۔ شاعری ان کا passion ہے جس کو وہ ترجمے میں ڈھالنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ میں نے ان کے نئے ترجمے دیکھے۔ اپنے بارے میں بتانے لگے کہ ملازمت کے بعد دوبارہ شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ خود کچھ لکھنے کے بجائے یہ سوچا کہ اتنا کچھ عالمی ادب میں لکھا گیا ہے، اسی کو دیکھنا چاہیے۔ ایک دفعہ مذاق ہی مذاق میں اپنے لیے قبر کا کتبہ لکھا۔ اس کی عبارت کچھ اس طرح کی تھی:

His share in life was that of amazement and his station, that of a common man.

ترجمہ ان کے اسی تحیر کا حصہ ہے۔

صبح ناشتے کے بعد کا خالی وقت میں اخبار کے ساتھ گزارتا ہوں۔ سب سے پہلے اخبار کے ان حصوں کو علاحدہ کرتا ہوں جو مجھے نہیں پڑھنے۔ تین چوتھائی bulk تو اسی میں نکل جاتا ہے۔ ''گلوب اینڈ میل'' کے مضامین دل چسپ ہیں مگر خبروں میں مقامی معاملات پر ہی بیش تر توجہ ہے۔ اخباروں کی گہما گہمی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ الیکشن کا اعلان ہونے والا ہے۔ سیاست جب رنگ پر آئے گی تو ہم یہاں نہیں ہوں گے۔ ہمارے لیے خزاں ہی کافی ہے۔

اخبار میں موسم کا حال سب سے زیادہ توجہ سے پڑھتا ہوں۔ کپڑے اور باہر نکلنے کا پروگرام اسی کے مطابق۔ آج کے لیے لکھا تھا کہ ''جزوی طور پر ابر آلود'' رہے گا اور چھینٹا بھی پڑے گا۔ چناں چہ ایسی دھوپ نکلی ہے کہ بس۔ چمکیلی دھوپ میں خزاں کے رنگ اور بھی کھل اٹھے ہیں۔

باہر نکلنے کے لیے بہترین موسم۔ ہم ایرین ڈیل پارک جاتے ہیں جس کے درمیان سے کریڈٹ دریا بل کھاتا ہوا نکل رہا ہے۔ لگتا نہیں کہ ایسا گھنا جنگل جیسا پارک شہر کے بیچوں بیچ ہوگا۔ شہر کو سانس لینے کی مہلت مل جاتی ہے۔

کریڈٹ دریا کے کنارے ریڈ انڈین ہر سال اپنے آباؤ اجداد کی روحوں کا جشن منانے آتے ہیں۔ میں نے دریا میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ پانی بہت یخ تھا۔ اس کے کناروں پر ہوا بہت تازہ۔ درختوں کا رنگ آج ایک آدھ آنچ تیز لگ رہا ہے۔

ہم پتوں کے رنگ دیکھ رہے ہیں۔ درختوں کو دیکھتے دیکھتے انتظار صاحب کہتے ہیں، ''تہذیبوں کا بھی تو یہی حال ہے۔ جب ان پر خزاں آتی ہے تو ان کے رنگ نکھرتے ہیں۔'' وہ decadent تہذیبوں کے بارے میں بیان جاری کرنے لگتے ہیں۔ پھر منیر صاحب سے کہتے ہیں، ''وہ تمھارا جون ایلیا ہے ناں جو شیشے کے فرش پر لوٹنے لگا تھا... میرا جی چاہ رہا ہے کہ ان پتوں پر لوٹ لگاؤں۔''

میں کہتا ہوں کہ جی چاہنے اور لوٹ لگانے میں جو فاصلہ ہے وہ جون ایلیا طے کر سکتے ہیں، ہم آپ نہیں۔

ہم ایک کیفے میں بیٹھے کیک کھا رہے ہیں اور کافی پی رہے ہیں۔ انتظار صاحب چائے پیتے پیتے دفعتاً کہتے ہیں، بس ہندوستان اسی وقت تک اچھا تھا جب جنگل تھا اور بھکشو گھوما کرتے تھے۔ کیفے کی میز بھی خزاں کے رنگوں سے جھلملا رہی ہے۔ خنک ہوا میں گرم کافی مزہ دے رہی ہے۔

کاہل، ست الوجود سمجھیں۔ میں آرام سے پڑھتا رہتا ہوں۔ منیر صاحب کی الماری میں سے کئی کتابیں میرے سرہانے بکھری ہوئی ہیں۔ انتظار صاحب آکتاویو پاز کی ہندوستان کے بارے میں کتاب پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے ہیرلڈ بلوم کی کتاب ختم کر ڈالی ہے۔ میں نے چومسکی کے مضامین کا ایک انتخاب اُٹھایا ہے۔ بھاری پتھر ہے۔ کینیڈین خواتین کے افسانوں کے انتخاب میں ہیمانی بیز جی کی ایک کہانی بھی ملی، عمدہ ہے۔

”میں نے ایک سال سے مٹی کو ہاتھ نہیں لگایا“ شہزاد عالم نے جواب دیا تھا جب میں نے ان سے ان کے کام کے بارے میں پوچھا تھا۔ ایک تخلیقی فن کار کا یہ جواب میرے دل پر جا لگا۔ خود مٹی نے ان کے بھرے پرے گھر کو ہاتھ لگا دیا۔ موت کا سرد ہاتھ۔

رائٹرز فورم کی فکشن ورک شاپ کی تفصیل تو لکھنے سے رہ ہی گئی۔ آئندہ فرصت تو جب ہوگی سو ہوگی، کچھ احوال تو لکھ ڈالوں جو یاد رہ گیا ہے۔

وہیں یورک لائبریری کے ایک نسبتاً چھوٹے کمرے میں منعقد کی گئی۔ چند نئے چہرے بھی تھے۔ سموسے اور کافی ایک طرف۔ تعارف کے مراحل سے گزرنے کے بعد انتظار صاحب نے گفتگو کی۔ چند باتیں میں نے کہیں۔ افسانے پڑھے گئے۔ گفتگو ہوئی، سوالات پوچھے گئے۔ بات سے بات نکلی۔ کچھ دیر کے لیے بہت لطف رہا۔

انتظار صاحب کی فی البدیہہ تقریر کسی نے ریکارڈ بھی کر لی ہے۔ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ ناول میں وعظ، تجزیے، نصیحت اور بہت کچھ سما سکتا ہے جب کہ افسانے میں یہ گنجائش

نہیں ہوتی، انھوں نے کہا، ''افسانہ بہت اکل کھری صنف ہے۔''
اور اس حوالے سے کہ افسانے میں بعض باتیں ان کہی چھوڑ دینی پڑتی ہیں، ہر بات کہی نہیں جاتی، ''افسانہ اندھیرے اجالے کا کھیل ہے۔''

میرے talking-points جو میں نے ایک استعمال شدہ لفافے کی پشت پر درج کر لیے تھے، پھر وہ بھی اِدھر اُدھر ہو گیا۔

افسانہ ورک شاپ، کرافٹ کی اہمیت، سیکھنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس طرح کی ورک شاپ کی ضرورت ہے۔ مگر عام طور پر اس طرح کی چیز ہمارے ہاں ہوتی نہیں ہے۔
کرافٹ، سیکھنے، سمجھنے، پریکٹس کرنے والی چیز ہے۔ الہامی نہیں کہ آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں۔ غیب سے آ بھی جائیں تو ان پر بڑھئی کا کام کرنا پڑتا ہے غلام عباس کی مثال۔

تکنیک کا تنوع۔ مارک شورر کا Technique as discovery افسانہ کون لکھتا ہے۔
فرینک او کاز کا Lonely Voice والا تصور۔ معاشرے کے حاشیے پر آئے ہوئے لوگ۔ امی گرنٹ ان میں شامل ہیں۔

افسانے کے عناصر۔ کردار، پلاٹ، زبان و بیان۔ یہ روایتی طور پر بھی تسلیم کیے گئے ہیں۔
زباں کے بارے میں روایتی تصور... منٹو کے تشبیہ و استعارات پر وقار عظیم کی داد، یہ تصور جامد ہے، افسانے کی زبان مختلف ہے۔

فضا، نقطۂ نظر، تفصیلات، جزئیات یعنی Significant detail۔ ان عناصر کی وضاحت۔
۱۲ ویں صدی کی دہلیز پر افسانے کی دو روایتیں... ایک چیخوف والی، دوسری بورخیس، کافکا والی (ہیرلڈ بلوم کا یہ خیال مفید ہے گفتگو کے آغاز کے لیے)۔
مگر ان دونوں کو بھی ملایا جا سکتا ہے۔ انتظار صاحب نے ہی چیخوف کی روایت کے افسانہ نگار سے شروع کیا اور cross-over کر کے بورخیس، کافکا کی روایت میں آ گئے۔
کیا افسانے میں بھی غزل کے دو اسکول کی طرح کوئی دو اسکول والی formulation کی گنجائش ہے؟

ورک شاپ میں جو افسانے پڑھے گئے۔

۱۔ فیصل فارانی... ''ٹوٹا ہوا خواب''

کہنا اور پانا، آگے والی اور پیچھے والی کا فرق۔ عمدہ نکتہ ہے۔ زیادہ واضح نہیں ہو پایا۔ کردار واضح نہیں ہیں، سچویشن واضح ہے۔ زبان کو علامتی انداز میں برتنے کی کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہو سکی۔

۲۔ طاہر اسلم گورا... ''دوسری سرزمین سے''

نئے ملک میں امیگرنٹ کا تحیر bewilderment بن گیا ہے۔ کردار کا بے نام چہرہ۔ بعض جگہ مصنف خود سامنے آ گیا ہے۔ افسانوی پیرایۂ بیان کا پردہ چاک کر کے۔

تفصیلات میں ایڈیٹنگ کی بہت گنجائش ہے۔ افسانے کا موڈ، جدید انداز کا ہے، مزید کام سے اور بہتر ہو جائے گا۔

۳۔ عابد جعفری... ''خط''

دو کشتیوں میں سوار، immigrants کا paradox۔ زبان و بیان پختہ ہے مگر موضوع پیش پا افتادہ۔ افسانہ سطح سے اُٹھ نہیں پایا۔

۴۔ خالد سہیل... ''کھلے اور بند دروازے''

مرد عورت کے رشتے کا موضوع، تفصیلات سے عاری بیان۔ نثری نظم کے قریب پہنچ گیا ہے۔ exploration of self مگر اصل کون ہے۔ پیاز کے چھلکے کی طرح پرتیں اترتی جاتی ہیں۔

۵۔ شکیلہ رفیق... ''لائف کال''

آخری فقرے غیر ضروری ہیں بلکہ کہانی کو خراب کر دیتے ہیں، give-away ہیں۔

اختتامی کلمات کے لیے چند باتیں جو میرے دھیان میں آئیں۔

افسانے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں مشاعروں سے علاحدہ ادبی فضا قائم کی جائے۔

افسانے کے فروغ کے لیے: لکھنا، پڑھنا، چھپنا یا سنانا/ بحث کرنا۔

بزمِ افسانہ قائم کی جاسکتی ہے۔

آج دھوپ کتنی چمکیلی ہے کہ آنکھوں میں چبھ رہی ہے۔ کراچی کی دھوپ کی طرح جو میری آنکھوں میں کرچی بن کر کھٹکتی ہے، میرے حواس کو تازہ رکھتی ہے۔ سبز، سرخ پھولوں والے پیڑوں سے جھلملاتی اترتی چلی آرہی ہے۔ درخت ہموار ہیں، گھنے نہیں ہیں۔ گاڑی ان درختوں کے درمیان گزرتی چلی جارہی ہے۔ میرے اور منیر صاحب کے اس وقت کے مکالمے میں پھر کراچی آگیا۔ کراچی کے کالج، پرانے تعلیمی ادارے اور ان کا زوال۔

منیر صاحب سے میری دوستی کی بنیاد، یہی ایک تعلق ہے، ایک مشترکہ احساس، میں انتظار صاحب کو بتاتا ہوں۔ منیر صاحب سراسر اپنے باپ کے بیٹے ہیں، یعنی اپنے والد کے علمی، ثقافتی ورثے کا احساس ان کے ہاں شخصیت کا ایک defining factor ہے، کلیدی عنصر۔ محض حیاتیاتی یا جینیاتی جبر نہیں ہے۔

ان کے والد، پروفیسر خواجہ آشکار حسین (جن کے نام پر ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا ہے) کراچی کی ان شخصیتوں میں سے تھے جنھوں نے بڑے مشکل، نامساعد حالات میں تعلیمی اداروں کو اپنے پیروں پر کھڑا کیا اور استواری سے چلا کر دکھایا، شہر میں تعلیم کا ایک مخصوص کلچر قائم کیا، جس سے میرا اور میرے خاندان کا گہرا تعلق رہا ہے۔

میں نے منیر صاحب سے کہا کہ ان کے والد کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر وہ بڑے واضح طور پر کسی اور عہد کی شخصیت معلوم ہوتے ہیں اور جلد ہی وہ وقت بھی آجائے گا کہ ان کا اور ان کے دور کا ذکر کراچی کے لوگوں کو افسانوی لیجنڈ معلوم ہوگا۔ نہ صرف یہ کہ وہ کلچر دم توڑ گیا بلکہ اس کی اقدار بھی ہوا ہوگئیں۔ شہر کی زندگی دولخت ہوگئی۔

میں اس پرانے، قبل ازمسیح قسم کے زمانے کا ہوں۔ آج کے کراچی میں محض anachronism۔ وہاں بھی اجنبی جس طرح یہاں ٹورنٹو میں ایک اور شہر، ایک اور زمانے کی باتیں کرتا ہوا... میرے اندر کا شور دفعتاً اتنا بڑھ جاتا ہے کہ میں گاڑی کا ریڈیو تیز کردیتا ہوں جہاں ایف ایم پر ہمہ وقت موسم کا حال نشر ہوتا رہتا ہے، موسم اور شہر کے ٹریفک کا حال۔

خالد سہیل سے مزید گفتگو۔ وہ ادبی سیاست سے دور رہتے ہیں اور مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ پیشہ ورانہ مصروفیت بھی بہت ہے۔ انھوں نے ریڈ انڈین نظموں کے کچھ تراجم مجھے پڑھنے کو دیے۔ انھوں نے ایک نئی راہ سجھائی اور میں اس پر چل پڑا۔ مس سی ساگا کی لائبریری میں جا کر ''پہلی اقوام'' کا ادب ڈھونڈ رہا ہوں اور ان کے مختلف ذائقے سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔

ان کو ایک جھوٹے مہذب طور پر ''پہلی اقوام'' کہہ دیا جاتا ہے... جس طرح اردو میں جمعدار کا لفظ بن گیا ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم بس اتنا ہے کہ اچھا سا نام دے کر ان کا قتل یا ان کو حاشیے پر رکھ دینا جائز ٹھہرتا ہے۔ ان کی تحریروں کا منفرد انداز:

روایتی گیت، قصے، کہاوتیں۔ فطرت کے بڑے مظاہر کے سامنے بچہ بن جانے والے انسان کی معصومیت، ہم آہنگی۔

جدید نظمیں۔ ایک طرف کر دیے جانے کا دکھ، غصہ جو پھٹ نہیں پڑتا، رہ رہ کر سلگتا ہے۔ روایت سے کٹ جانے کا دکھ اور اس کی اساس جاننے کی تگ و دو۔

ایک اجنبی زبان میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کا جبر اور اس زبان میں ہونے کا احساس۔

مادیت کی بڑھتی ہوئی یلغار میں فطرت سے اپنے کھوئے ہوئے رشتے ڈھونڈنے کی کوشش۔

زمین سے محرومی۔ فطرت سے کٹ جانے کی سوزش۔

معاشرے میں بچھڑے ہوئے ہونے کا احساس۔ بے زبانی کو زبان بنانے کی جدوجہد۔

یہ یقیناً ''عظیم ادب'' نہیں ہے۔ مجھے اس کو اور پڑھنا چاہیے۔

صبح سویرے انتظار صاحب چہل قدمی کے لیے چلے جاتے ہیں۔ نیچے کی پوری منزل میں بس میں اکیلا ہوتا ہوں۔ میں بستر میں لیٹ کر پڑھتا رہتا ہوں۔

پھر ناشتا اور اخبار۔ ناشتے کی میز پر چائے کی دوسری پیالی سامنے رکھ کر انتظار صاحب اور منیر صاحب سے باتیں۔

ناشتا ختم ہونے کے بعد میں کچھ دیر کے لیے یہ بیاض کھول لیتا ہوں۔ یہ میرا سفرنامہ نہیں بن سکتا۔ مجھے سفر سے زیادہ سفر کے دوران قیام سے دلچسپی ہے۔

چلتے چلتے ٹھٹھک جانا، رک کر ادھر اُدھر دیکھنا... میں اپنے آس پاس کے شہر کو دیکھتا ہوں اور اپنے آپ کو شہر دیکھتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

بس یہی داستان ہے۔ روح ایک اجنبی مکان میں آئی۔ جتنی بھی اس داستان میں آئی، وغیرہ وغیرہ۔

طاہر اسلم گورا۔ لاہور میں ملا تھا تو پبلشنگ کا ادارہ ٹھاٹ باٹ سے چلا رہا تھا۔ اس کے بعد اُس پر جو کچھ گزری، اس کا احوال مختلف ذرائع سے تھوڑا تھوڑا کر کے معلوم ہوتا رہا۔ کچھ ناقابلِ یقین سا۔

لاہور سے روس اور پھر کینیڈا۔ اس کی روداد کاؤنٹ آف مانٹی کرسٹو کی نئی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ کیا وہ اس سے ناول بنا سکے گا؟

آج صبح اخبار پڑھ کر انتظار صاحب تردّد میں آ گئے۔ کچھ سناٹے میں بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا، پاکستان کی کوئی خبر؟ وہ ایک آرٹیکل مجھے پڑھنے کو دیتے ہیں۔ چین کے ایک آدمی کا انٹرویو ہے جو تیانامن اسکوائر میں دوبارہ کبوتر اور چڑیاں چھوڑنا چاہتا ہے۔ چیئرمین ماؤ کی طرف سے چین میں کبوتر اور چڑیاں مار دینے کا حکم تھا کہ فصلوں کا نقصان کرتے ہیں۔ خبر میں لکھا تھا کہ چینیوں کی پوری ایک نسل جوان ہوئی ہے جو آسمان میں پرندوں کو اڑتے ہوئے دیکھنے کی عادی نہیں ہے۔ ”جس نے کبوتروں کے ساتھ یہ سلوک کیا، وہ انسان کے ساتھ کیا کرتا ہوگا؟“ انتظار صاحب مجھ سے پوچھتے ہیں۔

کیا بات ہے درختوں کی۔ ان درختوں سے بھی زیادہ ٹورنٹو کی سڑکوں پر جو چیز مجھے اچھی لگتی ہے وہ ٹریفک کا قرینہ ہے۔ ہر گاڑی اتنے ڈھنگ سے، ایسے طریقے سے اپنے راستے پر چلتی ہے کہ میں اس کو مڑ مڑ کر دیکھتا ہوں۔ یہ سب کس قدر مہذب اور متین معلوم ہوتا ہے۔ گاڑی کو کوئی اوورٹیک کرے گا تو ڈسپلن کے ساتھ، ہارن بجائے گا تو جیسے اس جسارت پر خود ہی

شرمندہ۔ کراچی کی سڑکیں اس کے مقابلے میں جس افراتفری کا منظر پیش کرتی ہیں، اس کا تصور ہی محال ہے۔ شور، رانگ سائیڈ، ہر شخص کی من مانی... پچھلے چند سال میں یہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ پاکستانی معاشرے کے زوال کی زندہ مثال بن گیا ہے۔ ہر شخص دوسرے سے آگے نکلنا چاہتا ہے، صحیح طور پر یا غلط طریقے سے اور ہر شخص سمجھتا ہے کہ قانون کی پابندی دراصل دوسروں کے لیے ہے، وہ خود اس سے مستثنیٰ ہے اور پھر گاڑی چلاتے چلاتے، آنکھوں میں خون اتر آنے کی وہ کیفیت... traffic rage جو کراچی کی علامت بن گیا ہے۔

ان صاحب کے والد میرے ابا کے دوست تھے۔ انھوں نے بہت اصرار سے اپنے گھر کھانے پر بلوایا۔ مشترکہ دوستوں، جاننے والوں کی فہرست کا تبادلہ کرتے رہے... کراچی والے! کسی اور جگہ، کسی اور وقت میں وہ میرے پہلے کے واقف کار ہوئے۔ انھوں نے اپنی بیوی سے ملوایا۔ انھوں نے اپنا اتا پتا بتایا... اوہو، وہ تو اسی محلے کی ہیں جہاں میں اٹھارہ، بیس سال رہتا رہا۔ مجھے ایک دھندلا سا شائبہ ہوا کہ میں نے ان کو پہلے بھی دیکھا ہے، میں ان کو جانتا ہوں، ان سب لوگوں کو، جن کو میں کراچی میں جان سکتا تھا۔ مگر وہ سب چلے آئے، ایک ایک کرکے۔ ان کی جگہ خلا رہ گیا۔ یہ پرانے محلے والے، اسکول کالج کے ساتھی، اب یہ ٹورنٹو اور نیویارک میں ملتے ہیں۔ ان کے ساتھ میری اس گم گشتہ زندگی کے سراغ بھی ملتے ہیں، عمرِ گزشتہ کی وہ کتاب جس کے اوراق پر ان ہی کے نام لکھے ہوئے تھے۔ مجھے اس پر افسوس نہیں کہ میں پیچھے رہ گیا۔ مجھے دکھ ان لوگوں پر ہے جو چلے گئے۔

لیکن لوگ اس تیزی سے جاتے رہے تو کراچی کا کیا ہوگا... absences کا شہر بن جائے گا... left-overs کا شہر... بچا کھچا، درماندہ شہر۔ جس میں وہ لوگ رہتے ہیں جن کو شمالی امریکی ملکوں کا ویزا نہیں ملا۔ جو یہاں اس لیے رہتے ہیں کہ ویزا کے لیے dropbox facility سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ قطار میں لگا ہوا شہر یعنی شہر کا شہر راہ میں ہے۔ left-overs... وہ جو بچے کھچے کھانوں کو ایک ساتھ جمع کرکے دیوانی ہنڈیا پکائی جاتی ہے... تیز آنچ پر کس نے چولھے پر چڑھائی تھی؟ اس ہنڈیا کے جلنے کی بو آرہی ہے، سارے شہر میں پھیلتی جارہی ہے۔

ہاربر فرنٹ میں میں جشن مصنفین (Festival of Authors) کی افتتاحی تقریب ہو
ناول نگار مورد یخائی رچلر کو خراج عقیدت (Tribute) ہے۔ ٹکٹ گھر میں ٹکٹ دینے والی ایسی
صورت کہ جی چاہے یہیں کا ٹکٹ لے لوں اور اسے ہی تکتا رہوں۔ مگر پیچھے لائن لمبی ہوگئی تھی،
اندر جانا پڑا۔ ہال میں حاضرین کی تعداد خاصی ہے۔ تقریروں میں ایک بات کا فوری طور پہ
احساس ہوا کہ پُرمزاح انداز میں، بہت محبت کے ساتھ لیکن انسانی کم زوریوں کے احساس کے
ساتھ مصنف کا ذکر کیا گیا۔ اس کی بلانوشی اور زہریلے فقرے اچھالنے کی عادت کا ذکر تقریباً
سبھی نے کیا۔ ہمارے ہاں ایسے موقعوں پر اوّل تو اسی طرح کی نوبت آتی ہی کہاں ہے... پُرتصنع
اور پُرتکلف رسمی الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ہم لوگ بہت بوگس اور بہت pompous باتیں
کرتے ہیں۔

تقریب کے آخر میں جب مورد یخائی رچلر کو اسٹیج پر بلایا گیا تو حاضرین نے کھڑے ہو
کر اس کا استقبال کیا۔ ہم اپنے ادیبوں سے محبت کا اس طرح اظہار کیوں نہیں کر سکتے؟ بعد میں
رچلر نے کتابوں پر دستخط کیے۔ منیر صاحب نے دو کتابوں پر دستخط کروائے۔ میں نے اس ادیب
کو بالکل نہیں پڑھا۔

تقریب میں ایک خالی کرسی رکھی گئی تھی، پین کینیڈا کی طرف سے ایتھوپیا کے نظر بند
شاعر کے لیے۔ اس کی تصویر کرسی پر رکھی تھی اور لوگوں سے کہا جا رہا تھا کہ اس کی نظر بندی کے
خلاف پٹیشن پر دستخط کریں۔ میں اس ادیب کے بھی نام سے واقف نہیں تھا، مگر اس لائن میں
شامل ہو گیا کہ یہ کام بہتر معلوم ہوا۔

رات کا کھانا پھر ''طباق'' میں۔ اس کے سامنے کئی ٹیکسیاں کھڑی ہیں۔ پاکستانی ٹیکسی
ڈرائیور خاص طور پر لاہوریے، جن کی تعداد کافی ہے، یہاں محفل جماتے ہیں۔ ہوٹل رات گئے
تک کھلا رہتا ہے۔ میں رشید ندیم کی باتیں بھی سن رہا ہوں اور پیچھے بڑے اسکرین پر چلنے والی
ہندوستانی فلم بھی دیکھ رہا ہوں۔ رشید ندیم بتا رہے ہیں کہ مولویوں کے زیر اثر کٹر پنتھی نوجوانوں
کی پوری ایک جماعت پیدا ہوگئی ہے اور وہ کیسی عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں۔ اسکرین پر قد

آدم راجیش کھنہ بھڑک دار نارنجی قمیص پہنے گا رہا ہے۔ اس نے سیاہ چشمہ پہنا ہوا ہے۔ اوہو، وہ تو اندھا بنا ہوا ہے۔ اسی لیے رُک رُک کر، ٹٹول کر چل رہا ہے۔ ایک دیسی نما آدمی قہقہہ لگا رہا ہے۔ میک اپ اور بھاری جوڑے والی ہیروئن آنسو پونچھ رہی ہے۔ آواز کم کی ہوئی ہے۔ مولویوں کی محیّر العقول باتوں کا ذکر جاری ہے۔ یہ لوگ قوم کو کس طرف لے جائیں گے؟

''آپ صبح تیار ہوجایئے گا۔ فلاں صبح آپ کو لینے آئیں گے۔ وہ پندرہ منٹ پہلے ہی پہنچ جاتے ہیں۔ وقت کے ملّو ہیں۔'' منیر صاحب اپنے مخصوص انداز میں مجھے بتا رہے ہیں۔
لوگوں سے ملاقاتیں کم اور شہر سے ملاقات زیادہ۔ اب یہ سلسلہ بنا ہے اور میرے لیے یہی بہتر ہے ورنہ ایک ڈر تھا کہ ہم یہاں آکر ایک ادبی سرکس کا حصہ بن جائیں گے اور گلی گلی گھمائے جائیں گے، لوگ ہمیں دیکھنے آئیں گے کہ اب دیس میں اس قماش کے جناور ہونے لگے ہیں۔ اس سے بچ گئے، یہ منیر صاحب کی بدولت ہوا۔

آج ساری شام مس سی ساگا کی لائبریری میں گزاری۔ کس قرینے سے کتابیں رکھی ہوئی ہیں اور سارا انتظام اس طریقے سے کہ پڑھنے میں مدد ملے، لوگ کتاب کی طرف ہاتھ بڑھانے پر مائل ہوں۔ ایک شیلف پر اردو کی کتابیں بھی ہیں۔ بیش تر ایسی کہ اس سے پہلے شاید ہی کسی نے ہاتھ لگایا ہو۔ سرکاری مطبوعات اور اندھوں کے لیے ریوڑیوں کی طرح بٹنے والے شعری مجموعے۔ غالباً لوگوں نے اپنے گھروں سے فالتو کتابیں، زکوٰۃ کی طرح نکال دی ہیں۔
لائبریری والے تو یہی سمجھیں گے کہ اس زبان کی کتابیں کوئی نہیں پڑھتا۔

میں نے کمپیوٹر پر تلاش کیا اور ریڈ انڈین، اسکیمو لوگوں کا ادب... ارے، توبہ! ''پہلی اقوام'' کا ادب... ڈھونڈا۔ کئی اچھے انتخاب اور مجموعے ملے۔ ان نظموں، بیانیوں میں فطرت سے قربت، ایک مٹتی ہوئی روایت، مغربی تہذیب کی یلغار اور کئی ایسے موضوع چھیڑے گئے ہیں۔
میں کتنی ہی دیر ان کتابوں میں کھوجتا، ڈھونڈتا رہا۔

انتظار صاحب اپنے بھانجے کے پاس ایڈمنٹن چلے گئے ہیں۔ اس لیے موقع غنیمت جان کر ہم اطالوی ریستوران میں کھانا کھانے گئے۔ شہر کا یہ علاقہ لٹل اٹلی کہلاتا ہے اور یہاں اطالوی ہوٹلوں کی بھرمار ہے... بالکل جیسے اس کے قریب ہی ایک علاقہ ننھا منا پرتگال ہے۔ کھانا بھی اچھا تھا اور ہوٹل کا ماحول بھی۔ یہ علاقہ مصوروں، فلمی ہدایت کاروں اور اسٹیج والوں کی آماجگاہ ہے۔ ایک سے ایک اچھی صورت سامنے سے گزر رہی ہے۔

کھانے کے بعد منیر صاحب اور طاہر اسلم گورا کے ساتھ کافی پینے گئے۔ اس کیفے کا نام بھی خوب ہے۔ جلی حروف میں لکھا ہوا ہے Sensual ۔ اس کے نیچے Lounge and Cafe ہے، ہم کاؤنٹر کے سامنے ایک میز پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کاپوچینو واقعی عمدہ ہے۔ کاؤنٹر پر کام کرنے والا لڑکا منیر صاحب سے کچھ کہتا ہے پھر ہماری میز کی طرف آتا ہے اور ایک سادہ سی بے تکلفی کے ساتھ اپنا تعارف کراتا ہے، ''میں علی ہوں۔ ایران سے آیا ہوں۔'' میں اس سے ٹوٹی پھوٹی فارسی بولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ''آپ کہاں زندگی کرتے ہیں؟'' ایرانی محاورہ مجھے اچھا لگا۔ اپنے شہر کا نام بتاتا ہوں۔ ''آپ کو یہاں اچھا نہیں لگا جو واپس جا رہے ہیں؟ آپ پھر دوبارہ آئیں گے؟''

پاکستان کا نام سن کر وہ کہتا ہے، ''ایران، افغانستان، پاکستان، فلسطین... سب جگہ مذہب کا نام لے کر لوگوں کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ حکمران لوٹ رہے ہیں۔ لوگوں کو کچھ نہیں ملتا۔ یہ سب اس لیے کہ امریکا خوش رہے۔ امریکی صدر اپنے ملک میں انتخاب جیتتا رہے...'' وہ آواز دھیمی کر لیتا ہے۔ ''میں ان ملکوں کے لوگوں پر ترس کھاتا ہوں اور جب میں وہاں تھا تو اپنے اوپر بھی ترس کھاتا تھا۔'' وہ کہتا ہے، ''ایران میں ہمارے پاس سب کچھ تھا، یہاں کچھ بھی نہیں... وہ اپنے بڑے حکمرانوں اور مذہبی اوتاروں کو گالی دیتا ہے۔ ''میں یہاں آ گیا ہوں۔ میرے گھر والے تہران میں ہیں۔ مجھے اپنی ماں کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانے یاد آتے ہیں۔ مگر میں یہاں خوش ہوں۔ مجھے یہ ملک اچھا لگتا ہے، یہ شہر اچھا لگتا ہے، یہ علاقہ اچھا لگتا ہے... میں سارے وقت کام کرتا ہوں۔ صبح ساڑھے سات بجے ریستوران کھول لیتا ہوں، پھر رات گئے

تک کام۔ مجھے ذرا سا وقت ملتا ہے تو سو جاتا ہوں۔ میری چھ مہینے کی بچی ہے۔ میں نے ایک چینی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ میں اس ریستوران کے پیچھے ہی رہتا ہوں...'' وہ جوش میں آکر بول رہا ہے اور بکلاوا کی ایک پلیٹ ہمارے سامنے لاکر رکھ دیتا ہے۔ ہم انکار کرتے ہیں اور وہ اصرار کیے جاتا ہے۔ پھر کوئی اور گاہک آگیا اور وہ کاؤنٹر پر واپس چلا جاتا ہے۔

یہ جگہ اچھی ہے، منیر صاحب یہاں دوبارہ آنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ گورا کو فکر ہے کہ اس کی گاڑی غلط جگہ نہ کھڑی ہو اور ٹکٹ نہ لگ جائے۔ سڑک کی رونق بھی سمٹ رہی ہے۔ بند دکانوں میں بتیاں جل رہی ہیں جیسے ابھی ابھی کوئی یہاں سے اٹھ کر گیا ہو۔ ٹورنٹو میں ایک اور دن تمام ہوا۔

عابد جعفری صاحب نے اپنے گھر کونڈوں کے لیے بلایا ہے۔ ارے، یہ تو رجب کا مہینہ ہے۔ کراچی میں تو عذرا عباس اپنے گھر اس اہتمام بلکہ شور سے بلاتی تھیں کہ سارا سال یہ دن یاد رہتا تھا۔ اب وہاں ہمارے بغیر کونڈے ہوں گے۔ شاید کونڈا ہوگا۔ مگر اس بار بھی کونڈے خالی نہیں گئے۔

عابد صاحب کا گھر جھیل کے کنارے ہے۔ میں سارے راستے پیلے پتوں کی سنہری بہار دیکھتا گیا... زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے... فیض کا مصرع یاد آتا تھا کہ مجھے لگا میں گھر پہنچ گیا ہوں۔

گھر کے بیس منٹ میں سارا اہتمام۔ چاندنی بچھی ہوئی اس پر باقاعدہ دسترخوان (چاندنی کو سیلوٹیپ سے جوڑا گیا تھا، بس یہی بات اکھر گئی ورنہ یہ منظر کراچی کے کسی گھرانے کا بھی ہوسکتا تھا)۔ کباب، پراٹھے، رس ملائی، ترکاری، چپاتی، واہ صاحب، مزہ آگیا اور سب سے بڑھ کر میٹھی ٹکیہ جس پر میری بہت جان جاتی ہے۔ ''میں تو اس ٹکیہ کے چکر میں یہاں آتا ہوں''، منیر صاحب نے کہا، ''یہ تو نوسٹلجیا کی ٹیبلٹ ہے!''

میں بتاؤں گا تو کون یقین کرے گا کہ ٹورنٹو میں کونڈے کھا کر آرہا ہوں۔ ٹورنٹو کے کونڈے، بروزن ''بنکاک کے شعلے'' جسے میرا کالج کا ہم جماعت اختر ہمیشہ بنکاک کے چھولے کہا کرتا تھا۔

سہ پہر سے ظفر کے ساتھ شہر کی خاک چھانتا رہا، روشن دکانیں، بلند عمارتیں، اجلے چہرے...

انتظار صاحب ایڈمنٹن سے واپس آ گئے ہیں۔ پوچھا کہ تم نے اس دوران کیا کیا۔ میں نے بتایا کہ ٹورنٹو میں کونڈے کھائے۔ ''مستحق تو میں تھا اور میں ہی محروم رہا!'' وہ ہنس کر کہتے ہیں۔

الیکشن کی خبروں میں بھی رنگ بدلتے پتوں کا ذکر آ جاتا ہے کہ جب یہ بیان دیا گیا تو موسم ایسا تھا اور چمن میں پتے جھڑے تھے۔ پتوں کے اس رنگ کو دیکھ کر کوئی یہ کہہ دے کہ ٹورنٹو میں سونے کے درخت ہوتے ہیں اور ایک موسم میں آ کر ان کا سونا جھڑ جاتا ہے۔ پیپل کے پتے بھبھوکا سرخ ہیں۔

ہاربر فرنٹ میں امیتاو گھوش سے سوال و جواب کا پروگرام جو حاضرین کے سامنے پیش کیا گیا۔ منیر صاحب نے ٹکٹوں کا انتظام کر لیا تھا، طاہر گورا اور نزہت صدیقی بھی اس سیشن میں شامل ہوئے۔ سفید بالوں کے باوجود امیتاو گھوش کا چہرہ شاداب ہے اور مسکراتا ہوا، پہلا تاثر اس نے خوش مزاجی کا دیا۔ دوسرا تاثر ذہانت کا اور وہ جب کہ اس نے بولنا شروع کیا۔ اس نے اپنے نئے ناول The Glass Palace کے بارے میں بتایا کہ کس طرح خاندان کے بعض افراد کی ان یادوں، باتوں سے اس کا خمیر اُٹھا جو برما کے بارے میں تھیں اور جو اس نے بچپن میں سنی تھیں۔ مگر اس سے سوال ادبی سے زیادہ سیاسی کیے گئے۔ ہندوستان پاکستان کے بارے میں وہی چند گھسے پٹے سوال... انگریزی زبان، نو آبادیاتی نظام کی باقیات، غربت، راج کی یاد تو نہیں آتی... پھر اس کے بعد مشرقِ وسطیٰ اور یہ کہ آپ کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا تو آپ کیا کرتے؟ غیر دلچسپ سوالوں کے گھوش نے دلچسپ جواب دیے۔

حاضرین کی باری آئی تو میں نے تقسیم کے بارے میں سوال کیا کہ یہ ایک مسلسل ادبی استعارہ بنا ہوا ہے، اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ جواب بڑا واضح، شفاف اور دوٹوک تھا۔ اسے ریکارڈ ہونا چاہیے تھا، علاوہ اور باتوں کے، اس نے یہ بھی کہا کہ تقسیم کی ذمہ داری میں

نہرو بھی برابر کے شریک ہیں اور اگر کیبنٹ مشن کے معاملے پر اڑ نہ جاتے تو حالات شاید ہل جاتے۔ تقسیم کے بارے میں مختلف perceptions کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ہندوستان کے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسلمان ہمیں چھوڑ کر چلے گئے جب کہ بعض دوسرے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خود ہندوؤں نے ہی ہم سے علاحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیا اور ہم سے جان چھڑالی۔ اس کو ۱۹۷۱ء کے بعد کے پاکستان میں بنگالیوں کے بارے میں مروّج رویوں سے ملا کر دیکھیے، ایک عجیب سی مشابہت نظر آتی ہے۔

گفتگو کے پروگرام کے بعد کتابوں پر دستخط کے وقت گھوش سے براہ راست بات چیت۔ وہ انتظار صاحب کو پہچان گیا کہ ان سے لاہور میں مل چکا تھا۔ میرے لیے کتاب پر دستخط کے ساتھ میرا نام اردو میں لکھ کر دیا۔ میں اس کتاب کو واپسی کے سفر میں جہاز پر پڑھوں گا۔ کہانی کے پھیلاؤ میں سفر اچھا کٹے گا۔

ٹورنٹو میں مقیم پنجابی ادیبوں کی انجمن ''قلماں دا قافلہ'' نے انتظار صاحب کو اور مجھے بلوایا ہوا تھا۔ یہ پروگرام مالٹن کے علاقے میں ہوا جہاں سکھوں کی خاصی تعداد ہے۔ بوڑھے سکھ اس پروگرام کے روح و رواں تھے اور انتظار صاحب کو دیکھ کر کھلے جا رہے تھے۔

''آپ کے قدرداں آخر سکھ ہی نکلے''، میں انتظار صاحب سے کہتا ہوں۔

اس پروگرام میں پاکستان کے پنجابی ادیب بھی شریک ہیں۔ طاہر گورا کے بعد نذیر کھوٹ نے انتظار صاحب کے بارے میں چند کلمات کہے۔ مجھ سے بھی بولنے کے لیے کہا گیا۔ میں گھبرایا کہ انتظار صاحب کے بارے میں مختصر گفتگو میرے لیے خاصا مشکل کام ہے۔

انتظار صاحب نے اس کے بعد تقریر کی۔ پھر سوال جواب، اس میں مزہ آیا۔ ان کے پاس پوچھنے کے لیے بہت سی باتیں تھیں، ہمارے پاس جواب میں بتانے کو۔ ایک نوجوان نے نوبیل انعام اور بین الاقوامی تناظر کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ اس پر انتظار صاحب پھلجڑی کے انار کی طرح چمک اٹھے۔ پروگرام خاصی دیر تک چلا۔ نزہت صدیقی نے اس مرتبہ بھی بہت مربوط اور مبسوط گفتگو کی۔ لکھنے پر آجائیں تو یہ خاتون اچھی نقاد ثابت ہو سکتی ہیں۔

گفتگو کے بعد گروپ فوٹو اور کافی۔ افسوس کہ یہ سب لوگ تصویر میں چہرے بن کر رہ

جائیں گے کیوں کہ ان کے ادب سے ہم واقف ہی نہیں۔

اس کے بعد دیوالی کے رنگ دیکھنے جیرارڈ اسٹریٹ۔ میلے کا سماں ہے۔ انتظار صاحب ڈھونڈ رہے ہیں کہ کسی دیوار، کسی منڈیر پر دیا جلتا ہوا نظر آئے۔ مٹھائی کی دکان پر انبار دیکھتے ہیں اور مٹھائی خریدنے کے لیے رک جاتے ہیں۔ میں چکھ کر دیکھتا ہوں۔ نہایت معمولی ہے۔ سڑک کے کنارے سامان بک رہا ہے، دکانیں سجی ہوئی ہیں، لوگوں کی بھرمار ہے، اس وقت کون یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ٹورنٹو ہے۔ نئی دلّی یا کراچی کا کوئی بازار نہیں۔

کشمیری چائے پینے کے لیے ہم فٹ پاتھ پر کھڑے ہیں۔ دکان پاکستانی کی ہے۔ دیوالی کی خوشی میں تیز آواز سے گانے بجا رہا ہے۔ نور جہاں کی چیختی ہوئی آواز میں ''نیناں والڑیا'' اور مسرت نذیر کی آواز میں ''کٹ کٹ باجرا...'' ٹورنٹو کی دیوالی میں نور جہاں کی آواز شامل ہے۔

اور یہ تو ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رش ویک اینڈ کی وجہ سے تھا۔ اصل دیوالی چار دن بعد ہے۔

دیوالی کی شام، نور جہاں کے گانے اور ہم چند پاکستانیوں کی دھواں دھار گفتگو رات کے کھانے پر۔ موضوع، وہی ملک کے حالات اور رائٹ ونگ کی دراندازی۔

مگر شروع میں ہم نے امیگرنٹز کی صورتِ حال سے کیا تھا۔ جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ طارق فتح نے ان دولت مندوں کا حال سنایا جو اپنی مصنوعی زندگی یہاں بھی کھینچ لاتے ہیں۔ ''مجھے نفرت ہے ان لوگوں سے جن کی بیویاں یہاں آکر بال پر آکسائیڈ بلانڈ کرا لیتی ہیں اور گارڈن پارٹیز میں ''عبڈول'' کا اہتمام کرتی ہیں جو شیف والی لمبی ٹوپی اوڑھ کر باربی کیو بناتا ہے اور چکن تکہ کے بارے میں پوچھتا ہے کہ میڈیم، ریر یا ویل ڈن؟''

ایک مشکل یہ ہے کہ اس طرح کے لبرل لوگ جب ہر چیز کا توازن اسلام... اصلی اسلام، جیسا کہ وہ اصل میں تھا... کے ساتھ قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو Jugglery کے ساتھ قائم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب ہاتھ سے یہ گیند گری، اس کو سنبھالا تو دوسری...

پھر ذکر ان مولویوں کا جو یہاں دین کی برتری قائم رکھنے کا اعلان کرتے ہیں۔ ایک مشہور مولوی صاحب جو مسجد کے چندے سے چھ لاکھ ڈالر کا غبن کرکے غائب ہوگئے۔ کس طرح مسجدوں کی پراپرٹی، لوگوں کے نہیں بلکہ چند مولوی حضرات کے نام رجسٹرڈ ہے۔ نوجوان لوگ جو عقیدے میں شدت کے قائل ہیں۔

ایک محفل میں لڑکی کا سوال کہ اسلام میں ڈیٹنگ کیسے کرتے ہیں؟ اس لیے کہ جب شادی میں مرضی اور پسند کی اجازت ہے تو پسند کیسے کریں گے؟

وہ پاکستانی خاتون جنھیں ان کی کمیونٹی نے عاق کردیا تھا ان کے والد کی نماز جنازہ کے لیے مسجد میں گنے چنے لوگ ہی آئے۔

پاکستانی معاشرے کے سارے تضاد جو یہاں بڑھ چڑھ کر نظر آتے ہیں۔

''فلاں صاحب قادیانی ہیں۔'' کسی نے آہستہ سے مجھ سے ایک صاحب کے بارے میں کہا جن کو میں نے خاصا تعلیم یافتہ اور ایک مہذب پایا۔ میں نے جواب میں ان صاحب کی طرف گھور کر دیکھا۔ یہ بے چارے persecuted لوگ اب شاید کبھی وطن نہ واپس جاسکیں گے۔ در بدری ان کا مقدر آخر کیوں بنی رہے؟

ہاربر فرنٹ میں آج بوسنیا کے ادیب الیگزینڈر ہیمن (Alexander Hemon) کی گفتگو سنی۔ میں نے اس کی کتاب کے بارے میں پہلے کہیں پڑھا تھا مگر کراچی میں وہ کتاب بھلا کہاں ملتی۔ اب یہاں کتاب بھی نظر آئی اور صاحب کتاب بھی۔

اس کی گفتگو میں سیاست کا کرب ایک فلسفیانہ ڈھنگ کی طرف جا رہا تھا۔ سوال اس سے بھی سیاسی زیادہ کیے گئے... سرائیوو کے حالات میں مغرب کی ذمہ داری، اب کیا بدلا ہے... مگر اس کے جوابات میں ایک تہ اور تھی۔

اس نے کہا کہ وہ امریکی ادیب نہیں ہے۔

Not an American writer, but a writer in America

''امریکی کہانی مجھ سے پڑھی نہیں جاتی۔ بے حد Dull ہے۔'' اس نے دوٹوک

رائے ظاہر کی۔ اس لیے کہ یہ دنیا کی حقیقت جیسی ہے، اس کو قبول کرکے اس کی ترویج کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ دنیا جیسی ہوگئی ہے، جو ہوتے ہوتے رہ گئی ہے، اس کو بھول گئی ہے۔ کہانی کا ایک مقصد اس بدلتی ہوئی حقیقت کو، لوگوں کے اس غم واندوہ کو محفوظ کرلینا ہے جسے تاریخ بھول جاتی ہے۔ فراموش اور نظر انداز کرکے آگے بڑھ جاتی ہے۔ .It is papered over۔ کہانی نہ لکھی جاتی تو لوگوں کا یہ ذاتی دُکھ کہاں ٹھکانے پڑتا؟

''برونو کا سوال کیا ہے؟'' اس نے خود ہی بتایا۔ یہ Absences کے بارے میں ہے۔ ان لوگوں کا غائب ہوجانا جن کو تاریخ نے مار دیا۔ ہولوکاسٹ کے یہودی نہ مارے گئے ہوتے تو اب کیسے ہوتے۔ سرائیوو کے لوگ...

تقریب کے بعد میں نے اس سے جاکر بات کی۔ اپنے شہر کا تعارف کرایا۔ اس لیے کہ Absences کا سوال میرے اندر سلگنے لگا۔ کراچی میں وہ سب نہ ہوتا تو کیسا ہوتا۔ اور اس شہر کا دُکھ کون لکھے گا؟ یہ سب تو بھلا دیا جارہا ہے۔ میں یہ کام نہ کرسکا، اپنے اس احساس کے باوجود۔ میرے جو کراچی والے افسانے ہیں ان کو ناکام افسانوں کے طور پر پڑھا جانا چاہیے۔ خیر، میں کیا میری بساط کیا۔ ہیمن کے ہاں تاریخ کے جبر کو کہانی بنا دینے کا ایک ایسا امکان ہے جو میرے بس سے باہر ہے۔

ہاربر فرنٹ سے اٹھ کر کشتی کے ذریعے وارڈ جزیرے پر گئے۔ نرم دھوپ میں پتوں سے بھرے ہوئے راستے پر چلتے رہے۔ سمندر کے رخ پر ہوا سرد تھی۔ بعد میں کتابوں کی دکان میں کتابیں دیکھنے اور کافی پینے گئے تو میں نے انتظار صاحب سے پوچھا۔ انھوں نے ایک صاحب کے افسانوں کے مجموعے کے بارے میں، جو کراچی کے واقعات کو موضوع بنا کر لکھا گیا تھا، یہ کہا تھا کہ اب اس طرح کے واقعات پر Realistic انداز میں نہیں لکھا جاسکتا۔ میں اس بات پر سوچتا رہا ہوں۔ اب کیا صورت ہونی چاہیے؟ تاریخ کا کرب بھی سامنے آئے اور واقعات کی صحافیانہ گردان بھی نہ ہو۔

بات شروع ہوئی مگر کوئی جواب نہ بن پایا۔ ہم کافی پی کر نیچے اتر آئے۔

فیصل فارانی کے گھر پر کھانے کے بعد شاعری کی نشست فی البدیہہ مشاعرے کی طرح ہو ہی گئی۔ منیر صاحب دیگر شاعروں کے برخلاف، شعر سنانے کے لیے موقعے کی تاک میں نہیں رہتے بلکہ خاصا گریز کرتے ہیں۔ وہ ان معنوں میں بھی atypical ہیں۔ لیکن آج ان کے سمیت سبھی نے شعر سنائے۔ خالد سہیل نے غزل پڑھی، عرفان عرفی اور رفیع رضا نے غزلیں پڑھیں، نزہت صدیقی نے نظم پڑھی، پھر اس کے بعد غزل۔ طاہر اسلم گورا کی نثری نظم تھی۔ رشید ندیم کی غزل خاصی پختہ تھی اور نظم daring۔ وہ اس کے موضوع کی وجہ سے سنانے سے جھجک رہا تھا۔ مجھے یہ نظم پسند آئی۔

ٹورنٹو کے مضافات کے ایک basement میں بیٹھے ہوئے دور دیس کی ایک زبان میں اپنے دل کے گہرے جذبوں کے اظہار کے لیے شعر سناتے ہوئے یہ مٹھی بھر لوگ...

سپر مارکیٹ سے انجیر آئے ہیں۔ سیاہی مائل سبز، گول، تازہ۔ ''لیجیے انتظار صاحب! یہ انجیر کھائیے۔ ان کا تو قرآن شریف میں بھی ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم کھائی ہے'' منیر صاحب کہتے ہیں۔

''اگر قرآن شریف ہندوستان میں نازل ہوا ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے آم کی قسم کھائی ہوتی۔'' انتظار صاحب انجیر کھاتے کھاتے کہتے ہیں۔

''ایک جہاں زاد تھی جس کا عاشق کوزہ گر تھا۔ ایک یہ شہرزاد ہیں جو خود کوزہ گر ہیں۔'' انتظار صاحب نے کہا۔ ہم شہرزاد عالم سے خداحافظ کہنے کے لیے گئے۔ انھوں نے اپنی وہی خاص الائچی اور گلاب کی کلیوں والی مہکتی ہوئی چائے پلائی۔ آج اس میں دو کلیاں ڈالیں، شاید اس شہر سے ہمیں سلامِ رخصت کہنے کے لیے۔

آج تھکا تھکا سا سورج نکلا۔ ہوا بھی ٹھنڈی تھی۔ ''یہ ونڈا لو موسم ہے'' انتظار صاحب نے اس کھانے کے نام پر کہا جو میں نے بڑے چاؤ سے منگوایا تھا اور بالکل ہی بوگس نکلا تھا۔

"جب منیر صاحب ملو کہہ سکتے ہیں تو میں وِنڈالو کیوں نہیں کہہ سکتا؟" وہ پوچھتے ہیں۔

جھیل کے کنارے ڈرائیو کرتے ہوئے کتنی ہی Canada Geese نظر آتی ہیں۔ کیا یہ سردی میں ہجرت کر کے گرم ملکوں کی طرف جاتی ہیں؟ میں سوچتا ہوں۔

گھاس میں کتنے ہی درخت ٹنڈ منڈ نظر آئے۔ وہ اپنے پتے جھاڑ چکے۔ ان پر خزاں کی بہار آئی اور گئی۔

ایک دو درخت ایسے نظر آئے تو میں نے غور کیا۔ کتنے ہی درخت خالی، خشک ٹہنیاں اٹھائے کھڑے ہیں۔ رنگ ان پر بیت چکے۔

اب درخت پتوں سے خالی ہونے لگے، مجھے اپنے شہر واپس جانا چاہیے۔ اباؤٹ ٹرن، کوئک مارچ... لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ... ٹوپی ڈھیلی پاجامہ ٹائٹ۔

نہ مجھے نیند آئی نہ میں پوری طرح جاگ سکا۔ اندھیرا ابھی ہے اور جہاز میں ایک ریڈنگ لائٹ بھی جل رہی ہے۔ اتنے دن سے جس کو اپنے آپ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا ڈپریشن کے گرم حیوانی نتھنوں سے وہ موت کی ایسی یخ بستہ سانس۔

میں اس ڈوبتے اندھیرے میں خزاں کے پتوں کے ان رنگوں کو یاد رکھنے کی کوشش کروں گا جو پیچھے رہ جانے والے اس شہر میں میں نے دیکھے...

۲۰۰۰ء

دمِ تحریر

لوگ ابھی آئے نہیں تھے۔

میں نے بھی ہاتھ مُنھ دھو کر کپڑے نہیں بدلے۔

دفتر سے واپسی پر میں سیدھا انتظار صاحب کو اپنے ساتھ گھر لیتا آیا تھا۔ وہ وہیں آ کر بیٹھ گئے جہاں ہم روزانہ شام کی چائے پیتے ہیں۔

"ارے تم سے ہی تو یہ بات شروع ہوئی تھی" وہ بہت بشاش انداز میں غزل سے کہتے ہیں جو یونیورسٹی سے آ کر سو گئی تھی اور کچی نیند سے ابھی اٹھی تھی۔ انتظار صاحب اپنے معمول کے مطابق بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہیں جب کہ غزل اور سیمیں اور میں زیادہ جوش کے ساتھ بار بار اسی سفر کا ذکر لے بیٹھتے ہیں جو چند ہی گھنٹے میں شروع ہونے والا ہے۔

خوش تو اپنے طور پر میں بھی ہوں مگر جانے سے پہلے اتنے کام سمیٹنے ہیں کہ اس کا سوچ سوچ کر بولایا جا رہا ہوں۔ یہ گھبراہٹ میرے ہر سفر کی ساتھی ہے اور تھکن یقیناً ہر سفر کا انجام! میں اپنے آپ کو باور کرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ سب دوسرے لوگوں پر ظاہر نہ ہو لیکن پھر بھی... بسکٹ کی پلیٹ آگے بڑھاتا ہوں لیکن انتظار صاحب اسے ہاتھ سے ایک طرف کر دیتے ہیں۔

سفر کسی بھی طرح شروع ہو اس کے بارے میں لکھنا بھی اپنے اندر ایک لالچ رکھتا ہے، ایک ترغیب۔ شاید میں نے ہی ان سے پوچھا ہوگا کہ اس سفر میں ان کے کیا ارادے ہیں۔
جواب میں ان کی مخصوص دھیمی مسکراہٹ۔
''میں بھی اپنے ان جونیئر معاصرین کے سامنے اعلان کروں گا جو سفر نامے بہت لکھتے ہیں کہ میں بھی نئے زمانے کا سفر نامہ لکھوں گا اور اس میں وہی سب لکھوں گا جو لوگ لکھتے ہیں... کوئی نہ کوئی تو مجھے بھی مل ہی جاتی ہے...'' ہنستے ہنستے وہ غزل کو سنانے لگتے ہیں کہ ہندوستان کے ایک سفر میں کس طرح مادھوری دکشٹ سے مڈھ بھیڑ ہوگئی تھی۔
''ارے وہ تو پارہ تھی پارہ... سارے بدن میں ایک بجلی سی بھری ہوئی تھی۔ ابھی دیکھا، پھر پھاٹک سے باہر اڑتی ہوئی چلی جارہی تھی... مجھے غالب کا ایک شعر یاد آیا جو اس کو سنا دینا چاہیے تھا...

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

''لیکن انتظار صاحب، آپ کو اس کے سامنے شعر پڑھنے کی مہلت ملی نہ کچھ اور یاد آیا''
میں ان کی بات پر ٹکڑا لگاتا ہوں۔ میں یہ یاد کیے بغیر کیسے رہ سکتا ہوں کہ میں بھی تو وہاں موجود تھا... لیکن کیا واقعی میں وہاں موجود تھا، اتنا ہی موجود جتنا کہ ابھی اور یہاں ہوں؟ ایک لمحے کے لیے ایک اندیشہ میرے دل میں سر اٹھاتا ہے کہ کیا یہ سب واقعی ہوا تھا؟ مجھے تو اب شُبہ سا ہونے لگا ہے لیکن وہ لمحہ جس کا اسیر میں بھی تھا ان کے بیان میں اب بھی اس لڑکی کی طرح مسکرا رہا ہے جو آئی اور تتلی کی طرح اڑتی چلی گئی... پھر وہ بات بھی بیچ میں رہ جاتی ہے۔ ہم کوئی اور بات کرنے لگتے ہیں، پاسپورٹ کہاں ہے اور ٹکٹ... ایئرپورٹ کے لیے گھر سے کتنے بجے نکلیں گے۔
اور اس وقت میں اب کتنا وقت رہ گیا ہے۔

تھوڑی دیر میں سب لوگ آنے لگتے ہیں، ایک ایک کر کے۔ یوسفی صاحب کی طبیعت خراب تھی، انہوں نے شام سے ہی معذرت کر لی تھی۔ سب سے پہلے زہرا نگاہ آتی ہیں جو

کپڑے میں لپیٹ کر لال سنہری رنگ کا امام ضامن لے کر آئی ہیں۔

''اس میں پاؤنڈ بندھے ہوئے ہیں، وہ لے کر کسی چرچ کے ڈراپ باکس میں ڈال دینا'' وہ مجھے سمجھاتی ہیں اور پھر امام کی ضامنی میں دیتے ہوئے پوری عبارت سنا دیتی ہیں۔ پھر آخر میں ''دشمن زیر پا'' کہہ کر با آواز بلند سوچتی ہیں، انتظار حسین اتنے بھلے آدمی ہیں ان کے دشمن کہاں ہوں گے؟

''دشمن نہ سہی، حریف تو ہیں'' میں بھی آواز کے ساتھ سوچتا ہوں۔

''نہیں، کوئی حریف نہیں...'' انتظار صاحب اس خیال ہی کو جھٹک دیتے ہیں۔

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ...'' کوئی اور کہہ رہا ہے، ''انتظار صاحب دل میں طے کر لیں اور بڑے پیر صاحب کی منّت مان لیں'' اور میرے والد اس پر سر ہلا رہے ہیں... ''تو پھر ہر کامیابی ان کے قدم چومے گی...''

پتہ نہیں وہ سن رہے ہیں یا نہیں، انتظار صاحب اس وقت پورے انہماک سے کیک کاٹ رہے ہیں اور ایک نہیں تو ڈیڑھ پھونک میں موم بتّی بجھا دیتے ہیں۔ فاطمہ حسن چُھری سنبھال کر کیک کاٹنے لگتی ہیں اور احمد شاہ تالی بجا رہے ہیں۔ زہرہ آپا ناصر کاظمی کی غزل کے چند شعر ترنّم سے پڑھتی ہیں۔

اور جیسے وقت تھم جاتا ہے۔

تھوڑی دیر میں ایئرپورٹ کے لیے گاڑی نکلے گی، میں نظریں بچا کر ایک بار پھر گھڑی دیکھ لیتا ہوں۔

پھر لوگ جو ایک ساتھ آئے نہیں تھے، ایک ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور رخصت ہونے لگتے ہیں۔ میرے گھر میں سنّاٹا بھر جاتا ہے اور بکھرا ہوا سامان جس میں سے کتنا کچھ مجھے ساتھ لے کر جانا ہے، میں اندازہ لگاتا ہوں۔ انتظار صاحب کمرے کے اندر جا کر لیٹ جاتے ہیں اور میں بتّیاں بجھاتا ہوا وہاں سے چلا جاتا ہوں۔ ابھی کچھ وقت ہے میرے اس سفر میں...

گاڑی چل پڑی، منظر بدل گیا۔

سامان رکھا جا چکا، ہم روانہ ہو گئے۔ خدا حافظ کہتے ہوئے ہاتھ پیچھے رہ گئے۔ کراچی ایئرپورٹ بھی خوش اسلوبی سے گزر گیا ورنہ ایئرپورٹ سے زیادہ مجھے اب اس کے راستے کی فکر ہونے لگی ہے۔ جانے کس وقت، کب اور کہاں... ناگہانی... رات کا سناٹا اور سڑک کے ساتھ خاموش کھڑے کھمبے، بند روشنیوں کی سراسیمہ وحشت جیسے سب دم سادھے، سہمے کھڑے ہیں۔ لیکن یہ بھی گزر گیا۔ ایئرپورٹ کے ڈیسک پر قطار نہ لگانے والے، مڈل ایسٹ آنے جانے والے جنہیں سہولت کی بہت عادت ہے اور یہاں بات بے بات شکایت ہوتی ہے کہ یہ پاکستان ہے... میں دل ہی دل میں ان پر مسکراتا ہوں اور ان کو چلتے پھرتے، بولتے دیکھنے میں یہ مرحلہ گزر جاتا ہے۔ مشکل استنبول ایئرپورٹ میں پیش آئی جہاں ہم ٹرانزٹ پر تھے پھر بھی سیکورٹی چیک سے گزرنا تھا، سفید فرش پر زرد قطار پار کرنا تھی —— اور وہ اہل کار مجھ سے پوچھ رہا ہے،

Purpose of visit?

مشہور مصنّف، پاکستان، عالمی اعزاز، تقریب میں شرکت، یہ سفر، میں نے اس کے سامنے ٹکڑے جوڑنے کی کوشش کی۔

اپنی طرف سے اسے کچھ نہ کچھ سمجھا دیا۔

مگر جو سمجھانے سے رہ گیا وہ میں خود...

ناولسٹ، پاکستان، آل رائٹ... تو آپ کون ہیں؟ وہ زور دے کر پوچھتا ہے۔ یہ آپ کے کون ہیں؟ میں پھر بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ کیا کام کرتے ہیں، وہ پاسپورٹ پر دوبارہ میرا نام پڑھتا ہے۔ ڈاکٹر؟ وہ پوچھتا ہے، میں جلدی میں سر ہلا دیتا ہوں۔

پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا؟ وہ بڑبڑاتا ہے اور قطار میں آگے بڑھا دیتا ہے جو جہاز کے اندر تک چلی جا رہی ہے۔

جہاز میں ہماری سیٹ الگ ہو گئی۔

میں پیچھے بیٹھ جاتا ہوں۔

میں یہاں ہوں، میں انتظار صاحب کو بتا رہا ہوں جو اِدھر اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ ان کی

سیٹ کے برابر بیٹھا ہوا سیاہ فام نوجوان اپنی جگہ سے کھڑا ہو جاتا ہے۔
وہ میرا کندھا ہلانے لگتا ہے۔

"I can come here so you can be with your Dad,"

وہ مجھ سے کہتا ہے۔

"Sure!" میں جواب دیتا ہوں اور شکریہ ادا کر کے جگہ بدل لیتا ہوں۔

میں کوشش کرتا ہوں کہ اس بات پر مسکرائے بغیر رہ سکوں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ واقعہ کتنی بار دہرایا جانے والا ہے۔

میں کتاب پڑھ پاتا ہوں اور نہ سو پاتا ہوں۔ جہاز کی آرام دہ سیٹ میں عجیب طرح کی بے چینی ہے۔

اسکرین کے اوپر ایک پیالے کی طرح اس کرے کا نقشہ بنا ہوا ہے، جہاں جہاں رات ہو رہی ہے ـــــ وہاں سایہ اور اندھیرا بڑھتا آ رہا ہے، ایک طرف مشرق میں اور اس کی دوسری انتہا پر مغرب میں۔ بیچ میں جہاز کا نشان ہے جو اب دھیرے دھیرے شہر کے نام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شہر کا نام روشن ہے۔

جہاز کا یہ نشان بڑی دیر سے اس جگہ ٹکا ہوا ہے ورنہ اس سے پہلے اسکرین پر ''وزرڈ آف اوز'' نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ جو اسکرین پر دکھائی دیتا ہے اگر وہی حقیقت ہے تو وزرڈ بھی موجود ہے اور جہاز کا نشان بھی... اور ان سے بڑھ کر ایلس منرو کی کہانیوں کا مجموعہ جو میری سیٹ کے ساتھ کھلا رکھا ہے اور بیچ میں، پڑھنے کی عینک سے نشانی کا صفحہ پتہ چل رہا ہے حالاں کہ دماغ کے کسی کونے کھدرے سے یہ nagging آواز آ رہی ہے، یہ مت کرو، کتاب کی جلد ٹوٹ جائے گی، عینک کی کمانی نکل پڑے گی۔ ذہن کے پردے پر مجھے میری ہی آواز ٹوک رہی ہے۔ میں سر ہلا کر دیکھتا ہوں، وہاں اندھیرا ہے۔

تھوڑی تھوڑی دیر سے اونگھنے کے بعد انتظار صاحب کی آنکھ لگ گئی۔ میرا زکام اب گلے

کی خراش بنتا جا رہا ہے۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔ جہاز پر حفاظتی پٹی باندھ لینے کا
نشان ایک بار پھر جل اٹھتا ہے۔

جہاز ایک دھچکے کے ساتھ رُکتا ہے تو وہ چونک اٹھتے ہیں۔

یہ کون سی جگہ آ گئی؟ وہ ہنستے ہوئے پوچھتے ہیں۔

یہ لندن ہے، میں ان سے کہتا ہوں۔

لندن؟ اتنی جلدی؟ وہ حیران سے لگ رہے ہیں۔

لندن نہیں ہوتا تو پھر کیا ہوتا؟ ہمیں اور کہاں جانا ہے ـــــ مجھے شہریار کی وہ غزل یاد آنے لگتی ہے جس کا رکارڈ فلم کی وجہ سے بہت جگہ بجتا ہے ـــــ یہ کون سی جگہ ہے دوستو، یہ کون سا دیار ہے۔

مگر مجھے جواب معلوم ہے۔

ہم اب اس شہر میں ہیں۔

ایک توقع سی جیسے میرے سینے میں دل بن کر دھڑکنے لگتی ہے۔

ہم آ رہے ہیں۔ ہم پہنچ رہے ہیں۔ ہم اس شہر میں گھومیں گے۔

ایئرپورٹ کا راستہ ہے یا شیطان کی آنت۔ ہم چلے جا رہے ہیں، چلے جا رہے ہیں، راستہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ ایک راہداری کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری، اس کے بعد پھر ایک اور...... انتظار صاحب نے ہاتھ میں چھڑی لے رکھی ہے، بیگ کندھے پر لٹکایا ہوا ہے اور مستعدی کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ''کہاں جانا ہے بھئی؟'' وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں یا شاید اپنے ہی آپ سے...... مگر میرے پاس جواب کوئی نہیں۔

ایئرپورٹ کے باہر ایک آدمی ہمارے نام کی تختی لیے کھڑا ہے۔ ہم اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ وہ سامان اٹھا لیتا ہے۔ سب کچھ بہت تیزی کے ساتھ ہوتا ہے اور ایک مرحلہ وار ترتیب کے ساتھ...... اس ہموار ترتیب پر اب تک میری حیرت ختم نہیں ہونے پاتی۔ ہم لوگ ہر بات

میں بھیڑ ہنگامے کے عادی ہو گئے ہیں، رُکاوٹ اور اُلجھن جیسے معمول بن گئے ہوں۔

"آپ یہاں آگے بیٹھیں گے؟" ٹیکسی ڈرائیور سامان اندر رکھنے کے بعد انتظار صاحب سے پوچھتا ہے۔

"نہیں، میں ادھر ہی بیٹھوں گا۔" وہ جواب دیتے ہیں اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر میں چونک گیا ہوں۔

"آپ نے غور کیا اس نے کیا کہا؟" میں چپکے چپکے ان سے پوچھتا ہوں۔

ہاں، وہ مجھ سے آگے آنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا میں یہیں ٹھیک ہوں، وہ بہت آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جیسے یہ بھی کوئی بہت معمولی سی بات ہو لندن کی ٹیکسی نہ ہو، ایسا روز ہی ہوتا آیا ہو۔

آپ نے سُنا، یہ تو اردو بول رہا ہے۔

اردو، ارے ہاں...... یہ تو...... وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ اتنے میں ٹیکسی والا بھی اندر آ گیا۔

اور سنائیے، کراچی کے حالات اب کیسے ہیں؟ ٹیکسی والا بیٹھتے بیٹھتے سوال داغ دیتا ہے۔

وہ بیک ویو مرر میں ہماری طرف دیکھتا ہے، پھر گاڑی اسٹارٹ کر دیتا ہے۔

میں نے پہچان لیا تھا آپ اپنے ہی لوگ ہیں...... وہ کہتا ہے۔ آپ بھی کراچی سے آئے ہیں۔

کراچی میں کہاں سے...... میں خداداد کالونی سے...... میرا گھر وہیں تھا۔ اور آپ؟

میں گلشن اقبال کا نام لیتا ہوں۔ اور دل ہی دل میں سوچتا ہوں کہ لندن آتے ہی پہلی گفتگو کراچی کے حالات پر ہو رہی ہے۔ The city I cannot leave behind۔ مگر مجھے سوچنے کا موقع کہاں ملتا ہے۔ وہ بول رہا ہے اور اپنی پوری زندگی کی کہانی سُنا رہا ہے۔ ومبلڈن سے کینسنگٹن تک آتے آتے میں یہ جان لیتا ہوں کہ اس کے والد ڈاکٹر تھے، احمد آباد

سے کراچی آئے تھے، یہ خود پڑھنے سے رہ گیا، بہن بھائی کھاتے پیتے ہیں...... بیٹی کو ڈاکٹر بنا رہا ہے، ۹۷ء میں یہاں آیا تھا، سال دو سال کے بعد واپس چکر لگاتا ہے۔ ایک بار لندن سے ڈرائیو کر کے گیا تھا...... ''تب حالات اور تھے!'' وہ کہتا ہے مگر اس سے زیادہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ملتا کیوں کہ ہوٹل کا بورڈ سامنے لگا ہوا ہے اور اب اسے پارکنگ ڈھونڈنا ہے۔

ہوٹل کے ریسپشن پر جو نوجوان بیٹھا ہوا ہے، وہ بہت مسکرا کر استقبال کرتا ہے اور نام کا اندراج کرتا ہے۔ ''انکل سے کہیں ادھر آ جائیں۔'' وہ مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ اب کی بار میں زبان پر نہیں چونکتا۔

میں فوراً نام اور شہر کا نام پوچھ لیتا ہوں۔ یہ پوری ٹیم حیدر آباد دکن سے آئی ہوئی ہے۔ ''باقی سب ٹھیک ہے۔ ناشتہ ادھر مت کیجیے گا۔ سالا سؤر کا گوشت ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔'' وہ اپنا نام بتا کر بہت رازداری کے ساتھ مجھ سے کہتا ہے۔

وہ مجھے آس پاس کی دکانوں کے بارے میں بتاتا ہے۔ میں ٹیلی فون کنکشن کے بارے میں پوچھتا ہوں اور قریب ہی کے اسٹور سے پھر ''ٹاپ اپ'' لینے چلا جاتا ہوں۔

شام ہونا شروع ہوئی ہے۔ اجالا پھیلا ہوا ہے۔ حالاں کہ گھڑی میں ہمارے حساب سے وقت کچھ اور ہے۔

انتظار صاحب اپنے کمرے میں سامان رکھ کر میرے کمرے میں آتے ہیں۔ جیسے دیواریں ناپ کر اندازہ لگانا چاہ رہے ہوں کہ کیا ادھر بھی وہی نقشہ ہے۔ ''یہ تو گھونسلہ ہے!'' وہ کہتے ہیں اور ہنس پڑتے ہیں۔

لندن میں پہلی شام کے مہمان۔ راشد اشرف اور دُردانہ انصاری آتے ہیں۔ انتظار صاحب سے ان کی تجدیدِ ملاقات ہوتی ہے۔ مگر وہ کھانے پر باہر جانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ تب ہم جا کر ایک جاپانی ریستوران میں کھانا آرڈر کرتے ہیں جو دردانہ انصاری کو پسند ہے۔ ''لندن میں اب اس کا بہت رواج ہو گیا ہے۔'' وہ مجھے ''واگا ماما'' کے بارے میں بتا رہی

ہیں جو ہوٹلوں کے اس زنجیرے کا نام ہے۔ کھانا بہت ذائقہ دار ہے مگر انتظار صاحب اپنی طرف
کے کھانے کے علاوہ کسی اور بات کے لیے تیار نہیں ہوں گے، یہ مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔
تصویروں کی ایک نمائش میں وہ سوشی کھا لیتے ہیں مگر پسند نہیں آتی۔
پسند آتا ہے تو کینسنگٹن کا وہ ہندوستانی ہوٹل جسے ہم پہلے دن ڈھونڈ لیتے ہیں، جس کے
نام میں تو کچھ اور آتا ہے، مگر سارا عملہ بنگلہ دیشی ہے۔

وہ ہمیں 'مسالہ چائے' پلانے پر مُصر ہیں۔

ہم بھی مان جاتے ہیں۔

لیکن اس وقت تک کے لیے۔

اگلا کھانا ایک اور مرحلہ ہے۔

میں اس کے بارے میں سوچنے کے لیے ابھی تیار نہیں۔

آنکھ تو میری بھی جلدی کھل گئی۔ انتظار صاحب پہلے سے تیار شاید ٹیلی فون کے پاس ہی
بیٹھے تھے۔

لندن کی گھڑیوں میں علی الصباح رہی ہوگی جب ان کا فون آنے لگا۔ ''بھئی آج کیا
پروگرام ہے؟'' وہ اس طرح پوچھ رہے تھے جیسے وہ چاہ رہے ہوں کہ میں ان کی مرضی کا جواب
دوں۔

''انتظار صاحب، ابھی تو ہوٹل اور دکانیں بھی کھلی نہیں ہوں گی......'' میری دلیل پر وہ
''اچھا......'' کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں، پھر اتنی دیر صبر کیے بیٹھے رہتے ہیں جتنی دیر میں تیار ہونے
میں لگاتا ہوں۔

مجھے اس بات کی فکر ہے کہ انہوں نے اپنے کمرے کا تالا ٹھیک بند کیا اور ان کو تشویش کہ
میں نے اگر کوٹ نہیں پہنا تو سوئٹر پہن لیا۔

صبح کی مخصوص خنک دھوپ میں...... اور دھوپ ایسی خنک اس شہر کے علاوہ اور کہاں
ہو سکتی ہے؟...... ہم نکل کھڑے ہوتے ہیں، پہلے پہل انتظار صاحب سگنل نہیں دیکھتے، سڑک کو

خالی دیکھ کر چل پڑتے ہیں، دوسری طرف سے گاڑی تیزی سے موڑ کاٹتی ہے تو پھر ٹھٹھک جاتے ہیں۔

کینسنگٹن کے آس پاس گھوم پھر کر ہم نے ناشتے کی معقول جگہ ڈھونڈ ہی لی، جہاں چائے ہمارے حساب سے ٹھیک تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ناشتہ لانے والی لڑکی پھر روز صبح صبح مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھ لیا کہ تم کس ملک سے یہاں آئی ہو؟

لتھوانیا، اس نے بتایا۔

میں چپ ہوگیا تو وہ بتانے لگی کہ یہ ملک کہاں واقع ہے۔

جواب میں اور کیا کہتا، میں نے بھی اپنے ملک کا نام بتا دیا۔

بلایا ہمیں بکر پرائز فاؤنڈیشن نے تھا لیکن پہلا جلسہ اردو والوں کا تھا۔ لندن سے دردانہ انصاری اور مانچسٹر سے باصر سلطان کاظمی، دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی، یعنی جلسے کا اہتمام کیا کہ ناصر کاظمی اور انتظار حسین کو خراجِ تحسین پیش کیا جائے۔ ساقی فاروقی نے صدارت کی اور انتظار صاحب نے گفتگو، یشب تمنا نے ناصر کاظمی پر مختصر مضمون پڑھا اور میں نے انتظار صاحب پر۔

ہمارے ہوٹل سے تھوڑی دور اسمٰعیلی سنٹر کی کشادہ عمارت میں یہ جلسہ ہوا۔ لوگ خاصے آئے، حالاں کہ لندن والے اب بھی اردو مرکز کو یاد کرتے ہیں، وہاں کے جلسوں کی سی رونق اب کہاں۔ رونق تو کیا، مل بیٹھنے کی جگہ بھی نہ رہی۔ افسوس کی بات ہے کہ یہاں اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی اردو کے لیے اس قسم کا تہذیبی، ثقافتی ادارہ نہ قائم رہ سکے۔ مگر شاید یہی ہمارا مزاج ہے۔

اس میں لندن کی کیا تخصیص۔

جلسہ ہوا اور بہت زوروں میں ہوا۔ بہت سے لوگوں سے ملنا ہوا۔ بی بی سی والے یاور عباس آئے ہوئے تھے اور رضا علی عابدی۔ یاور عباس کا نام پہلے بھی سن رکھا تھا اور ان کے بارے میں پڑھا بھی تھا۔ رضا علی عابدی کا میں نئے سرے سے قائل ہوا ان کی تحریروں کے ذریعے سے۔ کیا شگفتہ اسلوب ہے، لو دیتی ہوئی، مہکتی ہوئی نثر جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔

انتظار صاحب بہت اشتیاق سے یاور عباس سے ملے، پھر مجھ سے کہنے لگے کہ بی بی سی اردو سروس کا بھی عجب رومانس تھا۔ اس کا جادو سا ہم پر قائم ہوگیا تھا، اس کا تذکرہ قرۃ العین حیدر نے کیا تھا تو یہ ہستیاں اسی رومانس کا حصّہ معلوم ہوتی ہیں۔

رضا علی عابدی سے گفتگو بہت مختصر رہی۔ خیال تھا کہ پھر دوبارہ ملیں گے، وہ نہ ہو سکا۔ ان سے بات ہو رہی تھی کہ وہ ایک لڑکی کا تعارف کرا کے کسی اور طرف چلے گئے۔

''آپ نے مجھے پہچانا؟'' اس لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

میں حیران ہوا۔ شین قاف درست مگر انداز پھر بھی اس کے غیر ملکی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ ''میں ازبیلا ہوں، تمثال کی بیوی، نیّر مسعود کی بہو......'' وہ سارے حوالے بتاتی ہے۔

''آپ یہاں؟ آپ تو امریکا میں تھیں؟'' میں اپنی حیرت کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

''میں رضا علی عابدی صاحب کے یہاں ٹھہری ہوئی ہوں۔ دو ہفتے کے لیے لندن آئی ہوں......'' وہ کہتی ہے۔

میں دریائے حیرت میں غوطہ زن ہوں اور مجھے اسی عالم میں ٹھٹک جانا چاہیے۔ اس سے آگے کی داستان رضا علی عابدی کی زبانی میں بھی تو سنوں جنھوں نے پھر اس تقریب پر کالم کا مضمون باندھا۔ سو میں نے اخبار کے اس صفحے کی بھی پُڑیا بنا کر جیب میں رکھ لی کہ بعد میں کام آئے گی۔

ذرا سوچا تو مجھے اپنی تقریر بعد میں اور بھی زیادہ بُری معلوم ہوئی۔

جو مضمون لکھ کر لایا تھا، رنگ محفل دیکھ کر اسے بہت سمیٹا لیکن اختصار کے علاوہ کوئی خوبی اس میں داخل نہ کر سکا۔ میں نے ہمیشہ کی طرح ناظرین کے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔ یہ مضمون سُننے کا اتنا نہیں تھا جتنا پڑھنے کا اور اس مفروضے کے تحت پڑھا گیا تھا کہ انتظار حسین کے بنیادی تصورات (concepts) سامعین کے لیے بالکل سامنے کی بات ہوں گے اور بغیر یاد دلائے ذہن میں آجائیں گے اور ان تصورات کے ساتھ جُڑے ہوئے حوالے بھی۔ مجھے اپنا مقدمہ نئے سرے سے قائم کرنا چاہیے تھا اور چند ایک بنیادی باتوں کو دوبارہ جتانا چاہیے تھا۔

لیکن میں ایک بار پھر ایسا نہ کر سکا۔

انتظار صاحب کے بارے میں مختصر گفتگو کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے، تھوڑا سا ہکلاتے اور تُتلاتے ہوئے یہ تو میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا بُرا نہ ہوا۔ ساقی فاروقی اچھے رہے۔ صدارت کے زُمرے میں ڈیڑھ دو باتیں کہیں اور جلسہ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

جلسے میں موجود چند لوگ یہ قیاس آرائی بھی کر رہے تھے کہ مین بُکر پرائز انتظار صاحب کو ملے گا کہ نہیں۔ ''اس انعام کے لیے نامزدگی ہی اصل کامیابی ہے۔'' ساقی فاروقی نے ڈیڑھ جملے میں بات سمیٹ لی۔

بات تو باون تولے پاؤ رتی کی تھی، حالاں کہ ساقی فاروقی نے کہی تھی۔ مگر یہاں ان کے اختصار میں ایجاز کا رنگ تھا۔

ساقی فاروقی کو چہکتے ہوئے سنا تو اس مختصر سی نشست میں سنا جس کا اہتمام وہاں کے دو پُرجوش شاعروں نے کیا تھا، یشب تمنا اور ارشد لطیف۔

تصویر کھنچواتے وقت ساقی فاروقی نے پہلے ایک، پھر دوسرے نوجوان کو کیمرے کے سامنے کیا۔ ''ان کی شاعری ضرور سننا۔ تم کو مزہ آئے گا۔'' انہوں نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی۔ اور میں نے یہ ہدایت گرہ میں باندھ لی۔

سلیم فگار اور شہباز خواجہ۔ میں نے دونوں کی دو، دو غزلیں سنیں اور مجھے واقعی اچھی لگیں۔

''آپ کے کلام میں اتنی پُختگی کیسے آئی؟ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ شہباز خواجہ نے بتایا کہ لندن آنے سے پہلے راولپنڈی میں انہوں نے شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا اور ایک مجموعہ چھپ بھی چکا تھا۔

اب نیا مجموعہ ترتیب دے رہے ہیں، مگر کڑے انتخاب کے ساتھ۔ ''شروع کے دنوں میں ساقی صاحب نے ایک محفل میں کلام سُن کر کہا تھا، آپ کا نام نوٹ کر لیا گیا ہے، آپ کے

نام کے ساتھ اب کوئی کم زور چیز سامنے نہ آنے پائے، وہ مجھے بتاتے ہیں۔" ان دو شاعروں کے ساتھ ساتھ الیاس ملک کی نظم خوب تھی۔

ساقی فاروقی شاعروں کے اس حلقے کے لیے ایک بزرگ کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ مجھے اس بار قدرے دھیمے نظر آئے۔ میں نے ان کو اس سے پہلے اس عالم میں تو نہیں دیکھا، میں نے دل میں سوچا۔ Has Saqi mellowed down with age?

مگر وہ کھانے کے بعد میرے نزدیک آ کر بیٹھ گئے اور اپنے شب و روز کا احوال بتانے لگے۔ "میں نے سال بیلو کی تحریر میں پڑھا کہ

Nobody has explored depression and boredom.

میں اس کیفیت سے گزر رہا ہوں، دو سال سے کچھ نہیں لکھا....." انہوں نے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، "یہ تم لکھو۔ تمہیں آگے اور لکھنا ہے۔ تم یہ explore کرو....." وہ مجھے تاکید کرتے ہیں۔

پھر جب ہم واپس جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھنے لگے تو گلے لگاتے ہوئے کان میں چپکے سے کہنے لگے، "تمہارے چچا چلے گئے۔ ابا سے کہنا مجھ سے پہلے مت جانا....."

جیسے ایک لمحے کے لیے زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔

لندن کی ہوا اس وقت سرد نہیں تھی مگر میں کپکپا کر رہ گیا۔

نہیں، میں اس بارے میں کسی تعصب کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔ لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ بکواس کو سراہنے والوں میں شامل کیا جاؤں۔

شمالی امریکا یا انگلستان میں آباد نہایت معمولی اور بعض اوقات خراب شاعروں کی جس طرح پذیرائی ہوتے دیکھتا رہا ہوں اور جس طرح ان کے گھسے پٹے یا بُرے کلام کو آرائش و زیبائش کے ساتھ مسند نشین کیا جاتا رہا ہے، وہ خبردار کرنے کے لیے کافی ہے۔ میں یہ دھوکا بار بار نہیں کھانا چاہتا۔ میں تو یہ سوچ کر چلا تھا کہ اس قسم کے مشاعروں سے دور ہی بھاگوں گا۔ ساقی فاروقی نے اصرار کیا تو سوچا کہ یہ کہہ رہے ہیں، ان کی بات سنتے چلیں۔ یوں بھی ایک

آدھ غزلوں سے زیادہ کی نوبت نہیں آئے گی۔ لیکن ساقی کے کہنے پر جن دو نوجوان شاعروں کو سُنا، وہ ایک خوش گوار حیرت کا موجب ہوئے۔

یہ تازگی کی لہر ہے جو لاہور، کراچی، راولپنڈی یا ملتان، فیصل آباد بلکہ چھوٹے شہروں اور قصبوں سے ابھر کر آنے والے نوجوان شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔

لیکن پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا وہ اس کو برقرار رکھ سکیں گے؟

لندن میں رہنے والے اردو شاعروں کے لیے ایک چیلنج مزید: اپنی شاعری کی روایات اور اسالیب پر قائم رہتے ہوئے بلکہ ان کو ترقی دیتے ہوئے کیا وہ اپنے اردگرد ہونے والی شاعری سے، جو ظاہر ہے کہ کسی اور زبان میں ہے، کوئی معنی خیز مکالمہ یا تبادلۂ خیال کر سکیں گے؟ اس شہر کے شعری امکانات اور لسانیاتی مواقع۔ کیا یہ ایک نئے اسلوب میں ڈھل سکتے ہیں؟

ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

ساقی کی گفتگو اپنی جگہ۔ ارشد لطیف صاحب کے ہاں محفل میں انہوں نے ایک بار پھر اپنے محبوب کتے کی وفاتِ حسرت آیات کی تمام تر تفصیلات اتنے ہی جذباتی تعلق کے ساتھ سنائیں۔ کیسے کتّا کا دم اٹکا ہوا تھا، مگر روح قفسِ عنصری سے پرواز نہیں کرتی تھی، پھر ساقی فاروقی کو خبر دی گئی، وہ کسی دوسرے شہر میں شاعری کے اجلاس میں شریک تھے، وہ سب چھوڑ چھاڑ کر آئے۔ کتّے سے ان کی دل بستگی اور ان کا تعلق خاطر اپنی جگہ، نہ جانے مجھے ہر بار یہ توقع کیوں رہتی ہے کہ وہ ن۔م۔ راشد کے بارے میں کوئی چھوٹی سی، ذاتی یا نجی بات ایسی بتائیں گے جو پہلے سے معلوم نہ ہوگی، اس لیے کہ راشد سے ذاتی قربت رکھنے والے لوگ اور کہاں ہیں؟ مگر میری یہ توقع ان سے ہر ملاقات کے بعد حسرت ہی رہ جاتی ہے۔ جس اجلاس کو وہ چھوڑ آئے، اس میں وہ انگریزی کے غالباً سب سے بڑے زندہ شاعر شامس ہینی کے ہم راہ اسٹیج پر موجود تھے۔ انہوں نے شامس ہینی کا نام لیا تو میں چونک گیا۔ میں اس شخص کا کئی برس سے مداح چلا آ رہا ہوں جب کسی انتخاب میں اس کی مختصر نظم Death of a Naturalist پڑھی تھی اور نامانوس الفاظ پر اٹک کر رہ گیا تھا مگر نظم تھی کہ دل و جاں میں اتری جاتی تھی۔ پھر اس کی

اور نظمیں پڑھیں، پھر بے حد عمدہ لیکچرز کا مجموعہ پڑھا۔ لیجیے یہ صاحب تو اس سے کہہ سُن کر آئے ہیں۔ وہ کچھ اسی کے بارے میں بتاتے اور اس کا سلسلہ راشد سے جوڑتے، کچھ مماثلت، کچھ مغایرت کی بات کرتے ــــ مگر وہ گتّا ــــ میں نے اس بار تو ان سے یہ کہہ بھی دیا۔ ان کا جواب بھی غیر متوقع نہ تھا ــــ "ارے بدمعاش...!" انہوں نے مجھ سے کہا اور یہ کہہ کر پھر اسی طرح کی اور باتیں کرنے لگے۔ ایسے ساقی کا کیا کرے کوئی۔

میری آنکھ کھلی تو دھوپ نکل آئی تھی۔

گھڑی میں وہی صبح سویرے کا وقت۔

انتظار صاحب سوٹڈ بوٹڈ ناشتے کے لیے تیار ہیں۔ وہ اپنی چھڑی اٹھاتے ہیں اور نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

ناشتے کے بعد ہم صبح کی چائے کو دیر تک بہلاتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں اور میں ان جگہوں کو ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑتا ہوں جہاں پچھلے ستمبر میں، ٹھہرنا تھا۔ وہ عمارت، وہ گلیاں، وہ دکانیں جہاں میں گھوما کرتا تھا جب اپنے دفتر کی طرف سے لندن اسکول آف ہائجین میں ایک تربیتی کورس کے لیے آیا تھا اور اس وقت یہ علاقہ ہی میرے لیے لندن کا محور تھا۔ یہاں سے آگے بلومزبری، پھر برٹش میوزم اور پیدل چلتے چلتے چیرنگ کراس، پکاڈلی...... میں آج ان سب جگہوں سے اپنا رابطہ بحال کرنا چاہتا ہوں، ان کو سلام کرنا چاہتا ہوں۔ میرے قدموں کا اس شہر سے رابطہ بحال ہونا ہے۔ سو میں اب وہی کرنے چلا ہوں۔

سستے چائے خانوں اور ریستورانوں کے علاوہ، جن کی میں اس عرصے میں مستقل تلاش میں رہتا تھا اور بار بار بدل کر نئے ذائقے ڈھونڈتا تھا، ان جگہوں کو میں کتابوں کی دکانوں سے پہچانتا تھا۔ برٹش میوزیم کی پُرشکوہ عمارت کے سامنے والی گلی میں لندن ریویو آف بکس کی بجی سنوری دکان جس کے ساتھ ایک کشادہ سا کیفے بھی ہے اور جس سے میرا تعارف پچھلی بار عامر

حسین نے کروایا تھا۔ نئی سے نئی کتابوں سے الماریاں بھری پڑی ہیں اور سامنے کرسیاں بھی ہیں کہ browse کرنے میں خوب لُطف رہے۔ پھر مارچ مونٹ اسٹریٹ کے ایک کونے میں یہ لدی پھندی دکان جس میں پرانی کتابوں کی قیمتیں میری دسترس میں ہیں۔ Durs Grunbein کے مضامین کا مجموعہ وہیں سے پایا اور پھر اسے جستہ جستہ دیکھتا رہا جیسے کوئی جرعہ جرعہ پیتا ہے۔

میرے اپنے جسم میں دن ہے، باہر شہر میں اور شہر کی گھڑیوں میں رات...... سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے اندھیرا برس رہا ہے۔ مگر میری آنکھ کھل گئی ہے۔

کمرے کی چار دیواریں جیسے گرد گھیرا تنگ کر رہی ہیں۔

بے کیفی کے عالم میں سرہانے سے کتاب اٹھا لیتا ہوں اور ذہن پھر کسی اور راستے پر بھٹکنے لگتا ہے۔

وہی کتاب پھر میرے ہاتھ لگی...... Durs Grunbein کے مضامین کا مجموعہ جہاں سے پڑھتے پڑھتے اونگھ گیا تھا، وہی صفحہ کھل گیا۔ سمندری سفر کا استعارہ کلاسیکی یونانی ادب اور پھر دانتے کے حوالوں سے مزّین ہوگیا۔ ''جہازِ عمرِ رواں'' کا شعری سفر، زندگی سے گریز کی ایک صورت۔ لیکن اب کیا یہ سہولت بھی ہمیں میسر نہیں؟ وہ لکھتا ہے:

Our fantasies of sailing and circumnavigating the globe have turned into their inverse. We' ve lost the enthusiasm that only yesterday greeted the most highly evolved machines in the evolution of transport: the jets and rockets and space shuttles and railways.[1]

پھر کائنات کے دوسرے گناہ گاروں کی طرح ادب کے بڑے آوارہ گرد بھی دانتے کے جہنم میں پہنچ جاتے ہیں۔ دانتے کے مطابق، اودی سیوس بھی کھلے سمندروں میں ایک آخری اور بڑے سفر کی خاطر سب کو دھوکا دیتا ہے، بیوی، بچّے، نوکر چاکر اور اتھاکا کی بندرگاہ سبھی کو بتائے بغیر اس سفر پر روانہ ہو جاتا ہے جس سے واپسی کی کوئی امید نہیں اور اس کے لیے زندگی سے اہم

تر یہ سفر ہے۔

We aren't born to loaf around like beasts; only the man who seeks out danger will make discoveries.

اور اوڈی سیوس کا یہ سفر اسے سمندروں پار جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کا سفر، مصنف کے مطابق، رائگاں تھا، انسانیت کے لیے بے فیض۔

میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں اور پچھلے صفحے پلٹتا ہوا ان سطروں کی طرف آتا ہوں جہاں اس کا مشاہدہ عجیب ہے اور اس سے اخذ کردہ نتیجہ عجیب تر:

There in the transit lounge
Where downtime remains conscious to no end,
The proverb from the bars of Atlantis Swims in to Ken,
Travel is a fore-taste of Hell.

کیا سفر واقعی جہنّم کا پیش خیمہ ہے؟ میں دیر تک کتاب سینے پر رکھے گُم سُم رہتا ہوں۔ پھر اٹھ جاتا ہوں۔ بتّی جلاتا ہوں اور کپڑے بدلنے کے لیے چلا جاتا ہوں ـــــ آج پھر مجھے لندن کی ان پرانی گلیوں کو دوبارہ دیکھنا اور یاد کرنا ہے جو میرے لیے بہرحال جہنّم نہیں تھیں۔

اور میں یہ برابر سوچے جا رہا ہوں کہ اگر دانتے ایک نیا جہنّم تصور کرتا تو وہ سفرنامہ لکھنے والوں کے لیے کوئی نیا طبقہ ضروری تخلیق کرتا۔ ایک الگ طبقہ۔

خواہش اور کوشش کے باوجود مجھے اس نئے طبقے میں جگہ نہیں ملتی۔ گویا گھر سے چلے تو تھے لیکن یہاں بھی جگہ نہ مل سکی۔

نکھری سنوری دھوپ میں ہم باہر نکلے۔

ہمارے پروگرام کے منتظمین نے گاڑی بھیج دی تھی۔ ایس ایم ایس سے اطلاع آ گئی تھی، گاڑی کی آمد کا وقت یہ ہوگا، گاڑی کے ڈرائیور کا نام اور فون نمبر یہ۔ اس سے پہلے ای میل پر اطلاع آ چکی تھی کہ ہمیں فلاں گیٹ پر پہنچنا ہے اور وہاں سے داخل ہو کر کون سے کمرے میں جانا ہے۔

ہر چیز پہلے سے طے شدہ اور بالکل غیر شخصی انداز میں آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اور اس

کے ساتھ ہم بھی.....

مانچسٹر سے انتظار صاحب کے بھانجے مسعود اقبال اور ان کی بیگم بھی آ گئے ہیں۔ آج کے پروگرام میں وہ بھی ساتھ ہیں اور ان کے ہم راہ ہم ساؤتھ بینک سنٹر میں پہنچ رہے ہیں جہاں مین بکر پرائز کے آخری مرحلے کے لیے نام زد ہونے والے ادیبوں میں سے چند ایک اپنی تحریروں کے اقتباس پڑھ کر سنائیں گے۔ ان میں انتظار صاحب بھی شامل ہیں۔

ویسٹ منسٹر ایبے اور پھر دریا کے ساتھ ساتھ لندن ''آئی'' کے گول گول گھومتے پہیے کے سامنے سے گزر کر ایک پورا سلسلہ عمارتوں کا جن میں نہ جانے کتنی بہت سی سرگرمیوں کی تفصیلات تصویری اشتہاروں کی صورت میں آویزاں ہیں۔ ایسی ہی ایک دیوار پر میں لندن لٹریری فیسٹول کی تفصیلات پڑھ رہا ہوں جو ان تقریبات کے ساتھ شروع ہو رہا ہے۔

ریہرسل میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ طے یہ ہوا تھا کہ انتظار صاحب ''بستی'' کا ایک اقتباس اردو میں پڑھیں گے، پھر اداکار اسی کا انگریزی ترجمہ پیش کریں گے۔ یہی صورت چینی اور فرانسیسی ادیب کے لیے بھی تھی۔ انتظار صاحب کا اقتباس جس اداکارہ کو پڑھنا تھا وہ ہندوستانی نژاد خاتون تھیں۔ انہوں نے ساتھ بیٹھ کر پہلے تو سُنا۔ اصل زبان میں اس اقتباس کو سننے سے خود بھی لطف اٹھایا اور بعد میں پروگرام کے دوران اس تاثر کو سامعین تک منتقل کرنے میں بھی کامیاب رہیں۔

انتظار صاحب کے پڑھنے کے لیے ''بستی'' کا ابتدائیہ چُنا گیا تھا۔ ایک بچّہ دنیا کو اپنی نئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ دنیا جو بالکل نئی ہونے کے باوجود بہت پرانی بھی ہے۔ کہانیوں، روایات، اساطیر کی دُھند میں لپٹی ہوئی۔ اس لیے یہ حصّہ مجھے خاص طور پر پسند ہے۔ دنیا ایک بچّے کے ساتھ نیا جنم لے رہی ہے، نئی زندگی حاصل کر رہی ہے۔

انتظار صاحب اور ان کے بعد سُدھا نے یہ اقتباس سنایا اور بہت داد وصول کی۔

ریہرسل کے بعد ہم چائے پینے کے لیے ساتھ کے چھوٹے سے کیفے میں بیٹھ گئے۔ پروگرام شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ ہم لوگوں کو آتے جاتے دیکھ رہے تھے، پروگرام کے

انتظامی امور کی نگراں ٹروڈا اسپروئٹ تیزی سے جاتی ہوئی اور کسی نہ کسی ادیب کو ہم راہ لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

یہ بہت دیر سے آیا ہوا شخص جو الگ تھلگ بیٹھا ہوا ہے، جوسپ نووا کووچ ہے۔ بڑی خندہ پیشانی سے ملتا ہے، بہت گرم جوشی سے معانقہ کرتا ہے اور خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اسے اردو میں اپنی دو کہانیوں کی اشاعت سے خوشی ہوئی ہے جس کا وہ برملا اظہار کرتا ہے۔

یہ دبلی پتلی، ستواں سی اور کم عمر نظر آنے والی، سیاہ و سفید کوٹ اور گہری، شوخ لپ اسٹک والی ماری این ڈیائے ہیں۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات کرتی ہیں، پھر ایک طرف کو کھڑی ہوجاتی ہیں۔ زبان ان کے لیے واقعی مسئلہ بنی ہوئی ہے۔

مگر چینی ادیب کے لیے نہیں۔ وہ آتا ہے تو مترجم اس کے ساتھ ساتھ ہیں۔ ارے یہ تو آننتھ مورتی آرہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر دور سے ہاتھ ہلاتے ہیں۔ ان سے ملاقات برلن میں ہوئی تھی ــــــ یادگار ملاقات۔ لیکن اب یہ کتنے بوڑھے ہوگئے ہیں اور صحت بھی اچھی نظر نہیں آرہی۔ بیوی اور بیٹی ساتھ ہیں۔ اپنی خیریت بتاتے بتاتے بیماریوں کا حال سنانے لگتے ہیں۔

انتظار صاحب انہیں دیکھتے ہی آگے بڑھ کر گلے ملتے ہیں۔ دونوں بزرگ ادیب ایک دوسرے سے معانقہ کر رہے ہیں اور وہاں موجود ناظرین اور منتظمین بڑی دل چسپی سے یہ ملاقات دیکھ رہے ہیں۔ سینکڑوں کیمرے حرکت میں آگئے اور یہ دونوں ادیب اپنی باتیں کررہے ہیں۔

برلن کے سفر میں، میں بھی شامل تھا۔

اس کے بعد کٹھ منڈو میں ملاقات ہوئی اور ہم نے ایک پورا دن باتیں کرتے ہوئے گزارا، انتظار صاحب مجھے آننتھ مورتی کے بارے میں بتا رہے ہیں۔

آننتھ مورتی بھی بتا رہے ہیں کہ ابھی کنڑ زبان میں ان کی آپ بیتی کی پہلی جلد چھپی ہے۔ اس میں اس ملاقات کے بارے میں پورا ایک باب شامل ہے۔ وہ بھی اتنے ہی جوش کے ساتھ مل رہے ہیں۔

آخری مرحلے کے لیے نام زد ہونے والے دس ادیبوں میں سے سات یہاں موجود ہیں۔ تعارف، سلام دعا اور انہماک کے ساتھ باتیں چل رہی ہیں مگر ٹروڈا آتی ہیں اور سب کو ہنکا کر باہر اس طرف لے جاتی ہیں جہاں گروپ فوٹوگراف کھنچے گی۔ سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور مختلف اخباروں کے نمائندے تصویریں کھینچ رہے ہیں۔

انتظار صاحب اور آننتھ مورتی کی ملاقات کے بارے میں پوچھنے کے لیے ٹروڈا دوڑی دوڑی آئیں۔ ''کیا یہ بہت اہم اور معنی خیز نہیں ہے؟ کیا یہ دونوں پرانے دوست ہیں، ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟ اپنے اپنے ملکوں میں نہیں مل سکتے اس لیے تیسرے ملک میں مل رہے ہیں؟ اس انعام کا موقع ان کو ایک بار پھر ساتھ لے آیا ہے؟ یہ دونوں باتیں کس زبان میں کرتے ہیں؟''

''انگریزی میں'' میں نے صرف آخری سوال کا مختصر جواب سب سے پہلے دیا۔

سننے میں سب سے زیادہ مزہ جو آیا وہ چینی ادیب کا اقتباس تھا۔ یان لیانکے نے پہلے چینی زبان میں پڑھا، پھر اداکار نے وہی ٹکڑا انگریزی میں سنایا۔ یہ اس کے ناول Lenin's Kisses کا پہلا باب تھا جو عین گرمی کے موسم میں برف باری کا حیرت انگیز بیان تھا، تفصیلات سے معمور اور مسحور کن۔ سب سے پہلے یہی کتاب پڑھوں گا، تقریب کے دوران ہی فیصلہ کر لیتا ہوں۔

بعد میں آنے والے دنوں نے بتا دیا کہ میرا انتخاب غلط نہیں تھا۔

مگر اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ یان لیانکے ہی بکر انعام جیتنے والا خوش نصیب ہوگا۔

میرا اندازہ میری پسند کے مقابلے میں غلط نکلا۔

سب سے آخر میں آنے والوں میں لیڈیا ڈیوس تھیں۔ وہ بہت سادگی کے ساتھ داخل ہوئیں۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ ان کو یاد تھا کہ میں نے ان کو ای میل کر کے ان کی کہانیوں

کے ترجمے کی اجازت مانگی تھی۔ وہ اپنی تصویر سے زیادہ عمر رسیدہ نظر آئیں جب کہ ماری این ڈائے کم عمر اور پیٹر اسٹام بھی۔ ڈبلا پتلا اور چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں نمایاں، پیٹر اس کے بعد جب بھی نظر آیا مسکراتا ہوا نظر آیا۔

پیٹر کے ساتھ اس کی دوست بھی تھی لیکن کھانے کے دوران ماری مجھے ایک بار پھر الگ تھلگ اور تنہا کھڑی نظر آئی۔

میں نے یوں ہی کوئی بات شروع کی تو اس نے کہا، آج کل ادبی انعامات پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جانے لگا ہے۔ میں اس بات کو ٹھیک نہیں سمجھتی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

میرا کیا خیال ہونا تھا، فوراً گفتگو چھڑ گئی کہ اگر زبان کا مسئلہ درمیان نہ ہوتا تو گرما گرم بھی ہو سکتی تھی۔

میرا نام ماری این ڈیائے ہے، میرے پوچھنے پر وہ اپنا پورا نام تلفظ کے ساتھ بتاتی ہے۔ نام کا املا میں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر 'دنیا زاد' میں لکھا تھا، وہ غلط ثابت ہو گیا۔ غالباً سینی گال کے تلفظ اور فرانسیسی مروّجہ تلفظ میں فرق ہے۔ لیکن بہر حال یہ ان کا اپنا نام ہے، وہ جس طرح ادا کریں!

تقریب سے منسلک ریپشن غیر رسمی تھا اور اس میں لوگوں سے ملنے، بات چیت کرنے کا زیادہ موقع تھا لیکن ڈنر زیادہ پُرتکلّف تھا، ایک جگہ بیٹھنے کی پابندی۔ اس تقریب میں لکھنے والوں کے علاوہ اور بھی کئی لوگ تھے۔ ایک صاحب سے بطور خاص ملوایا گیا جو اس فاؤنڈیشن کے سربراہ ہیں، بڑے بزنس مین، کروڑوں کے مالک اور ساتھ ہی ادب سے دل چسپی رکھنے والے۔ میں نے ان سے ہاتھ تو ملا لیا مگر سمجھ میں نہ آیا کہ اور کیا بات کروں۔ میں پھر دوسری طرف متوجہ ہو گیا جہاں ساؤتھ بنک سنٹر کی ایک عہدہ دار خاتون کھڑکی سے نظر آنے والی دیوار کے بارے میں بتا رہی تھیں کہ اس پر شاعری سے نقوش بنائے جائیں گے اور یہ کہ شاعری کو پبلک اسپیس میں نمایاں ہونا چاہیے۔

میرے ایک طرف پیٹر اسٹام بیٹھا ہے۔ دوسری طرف خاتون ہیں جو

The Economist کے لیے کام کرتی ہیں اور اس پروگرام کے منتظمین میں سے ایک ہیں، گفتگو
نہایت دل چسپ اور موضوعات ایک کے بعد ایک۔ ظاہر ہے کہ جتنے سوالات تھے ان کا محور
پاکستان تھا اور ایک ناقابل یقین سی کیفیت کہ ہم تو سمجھتے تھے وہاں صرف دہشت کا راج ہے۔
میرے لیے ایسے سوالات پر بات کرنا ناگوار بھی ہے اور مشکل بھی۔ میں اپنے ہی ملک
کے اور اپنے اسٹیریو ٹائپ سے کیسے ہر وقت نبرد آزما رہوں؟

پیٹر اسٹام سے باتیں کرنے میں مجھے بہت لطف آ رہا ہے۔

وہ عام انداز سے باتیں کیے جا رہا ہے۔ اس میں کسی قسم کا pretension نہیں ہے۔
وہ افسانے، ناول اور صحافیانہ مضامین لکھنے کے بارے میں سیدھے سادے طریقے سے بول رہا
ہے جیسے یہ معمول کی بات ہو۔ صحافت کی وجہ سے اس کے ملک کے لوگ اسے پہچانتے ہیں مگر
اب اس قسم کی تحریریں اس نے کم کر دی ہیں کیوں کہ اس کی زیادہ توجہ فکشن پر ہے۔ ''فکشن لکھنے
سے میرا گزارہ ہو جاتا ہے۔ سال میں کئی بار پبلک ریڈنگز کرتا ہوں۔ ان سے آمدنی ہو جاتی
ہے......'' وہ بڑی صفائی سے بتا رہا ہے۔

پھر وہ اپنی کہانی کے اردو ترجمے کے بارے میں پوچھتا ہے جس کی اجازت کے لیے میں
نے اسے ای میل کیا تھا۔ میں نے بتایا کہ ترجمہ، نیویارک میں مقیم افسانہ نگار سعید نقوی نے کیا
اور کہانی کے ساتھ انصاف کیا۔ اتنا کہ میں اشاعت کے خیال سے ہچکچا گیا کہ بعض معاملات کا
بیان بہت واضح ہے۔

''پھر تم نے کیا کیا؟'' وہ مجھ سے سوال پوچھ رہا ہے اور اس کی گہری آنکھیں ہنس
رہی ہیں۔

''میں چاہتا ہوں کہ اس کہانی کی وجہ سے کوئی مشکل نہ آئے۔ مگر تم نے شراب کا ذکر تو
نہیں کاٹ دیا؟'' وہ سرخ جام لہراتے ہوئے پوچھتا ہے، اور پھر بتاتا ہے کہ اس کے افسانوں
کے دو مجموعے فارسی میں ترجمہ ہوئے ہیں مگر مترجم ہر بار اجازت مانگتا ہے کہ شراب کا ذکر نکال
دیا جائے۔

حافظ کے ملک میں ایسا ہوتا ہے؟ میں تعجب سے پوچھتا ہوں۔ مگر وہ جنس کے بیان کا کیا کرتے ہیں؟

نہ میں نے پوچھا نہ انہوں نے بتایا، وہ بہت بشاشت کے ساتھ جواب دیتا ہے۔ مجھے بھی ہنسی آ جاتی ہے۔

لیڈیا ڈیوس سے بات کرتے ہوئے میں خود ہی جھجک رہا تھا۔ مگر انہوں نے میرے اندیشوں کو غلط ثابت کر دیا۔ اصل میں، ان کی کہانیوں کی اردو میں اشاعت کے لیے اجازت مانگتے ہوئے میں نے غلطی کر دی تھی۔ نام ان کا لکھا، سامنے کہانی کسی اور کی۔

ان کا مختصر جواب پُر لطف تھا کہ وہ بُرا ماننے کی بجائے ناموں کے تفاوت سے محظوظ ہوئی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اس پر ایک افسانہ بھی لکھا جا سکتا ہے۔

وہ جلدی ہی باتیں کرنے لگیں مگر ان کے آس پاس کوئی نہ کوئی مداح پہنچ جاتا تھا تو پھر باتوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا تھا۔ وہ مجھ سے بھی بہت سی باتیں پوچھ رہی تھیں، دوسرے کا نقطۂ نظر ماننے اور سننے کے لیے تیار تھیں۔ ان سے بات کر کے ان کے مطالعے کی وسعت اور خیالات کی گہرائی کا اندازہ ہوتا تھا۔

لیکن یہ محفل بھی تمام ہو رہی تھی۔

لوگ ایک ایک کر کے جانے لگے۔ آننتھ مورتی لکڑی ٹیکتے ہوئے لفٹ کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ اس کا مطلب ہے اب ہمیں بھی جانا ہوگا۔ وہاں سے اٹھنے کا دل کس کم بخت کا چاہ رہا ہوگا۔ دل چسپ ادبی باتوں کا سلسلہ آج یہیں پر ختم۔ پھر جب ملیں گے تو صورت حال بدلی ہوئی ہوگی۔

جوسپ نوا کووچ ٹہلتا ہوا ٹیرس پر آ گیا۔

وہ اپنے افسانوں کے موضوعات کا دفاع نہیں کر رہا بلکہ یہ بتا رہا ہے کہ اس کی وجودی

حالت یہی ہے۔ ''میرے پاس تفصیلات بہت ہیں۔ ان کی وجہ سے افسانے لمبے ہوتے چلے جاتے ہیں۔'' وہ کہتا ہے۔ مگر پھر بھی ناول ایک ہی ہے، میں حیرت سے پوچھتا ہوں۔

ناول تو میں نے کئی لکھے، وہ ایک تعداد کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔ مگر میرے ایجنٹ نے ان کو پسند نہیں کیا۔ پھر میں نے بھی چھوڑ دیا۔ جب افسانہ طویل ہونے لگتا ہے تو پھر مجھے خیال رکھنا پڑتا ہے، وہ بہت صاف گوئی سے کام لیتا ہے۔ پھر ایک بار اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ اس کے افسانے ایک ایسی زبان میں چھپ گئے ہیں جس کو وہ بالکل نہیں جانتا۔

''اور اب میں کینیڈا کا شہری بن گیا ہوں۔ میرے کاغذات پہنچ گئے ہیں.....'' اس کی گفتگو میں صاف دلی اور کھرا پن ہے۔ اس لیے اس کی باتیں اور بھی دل چسپ لگتی ہیں۔

جو لوگ نہیں آسکے ان میں مجھے خاص طور پر روسی ادیب ولادی میر سوروکی سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے۔ اس کی تحریروں سے ایک سیماب صفت شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ میریلیں روبنس بھی نہیں آئی ہیں۔ افسانے کے ترجمے کی اجازت مانگنے پر انھوں نے مجھے بہت اچھا اور فراخ دلانہ ای میل لکھا تھا۔

اگلی صبح، نئے مرحلے۔

انتظار صاحب کے بھانجے کو آکسفرڈ اسٹریٹ جانا تھا۔ تقریب کے لیے سیاہ ٹائی کا بندوبست بھی کرنا تھا اور پہلے اسی پر تحقیق ہوئی کہ اس سے مراد وہ چیز ہے جسے ہم ''اپنی طرف'' بو کہتے ہیں۔ ''ماموں، آپ واحد پاکستانی ہیں جو یہاں آئے ہیں اور آپ کو شاپنگ پر جانے سے دل چسپی نہیں ہے.....'' وہ انتظار صاحب سے کہتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ ہم سارے شہر کا ٹور کرنے والی بس میں بیٹھ جائیں۔

''یہ اسی طرح رینگ رینگ کر چلے گی؟ انتظار صاحب کو بس ٹور کا تصور کچھ خاص پسند نہیں آتا۔ کمال ہے، وہ تھوڑی دیر بعد کسی عمارت کو دیکھ کر سراہنے لگتے ہیں۔

امپریل شہر کی عمارتوں کو دیکھتے دیکھتے وہ اچانک مجھ سے کہتے ہیں، اب میں واپس جا کر

مسافرانِ لندن پڑھوں گا، سرسید نے اس شہر میں کیا دیکھا۔

بس آہستہ آہستہ چل رہی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے جھوم جھوم کر چل رہی ہے۔ باہر بادل ہیں اور ٹھنڈی ہوا۔ کھڑکی کے باہر لندن کا موسم اور عمارتوں کا منظر لمحہ لمحہ بدل رہا ہے۔ مجھے دھندلا احساس ہوتا ہے کہ وہ ان سب باتوں کو تاریخ کے تناظر میں دیکھنے کے عادی ہیں، تجربے کا دھاگا ان کے لیے تاریخ کے تانے بانے میں گندھا ہوا آتا ہے۔

جُوں جُوں انعام کی تقریب کا وقت قریب آ رہا ہے میں اس کے بارے میں زیادہ سوچ چلا جا رہا ہوں۔

دن بھر کے کاموں سے، نئی جگہوں کی سیر اور دیکھنے کے تجسّس کے دوران یہ خیال برابر میرے ذہن کے مدار میں کسی سیّارے کی طرح گردش کیے چلا جا رہا ہے۔

ایک دوست نے فیس بک پر اندراج کیا ہے:

All should culminate in Intizar Sahib recieving the prize.

میری دلی تمنّا تو یہی ہے کہ یہ اعزاز انتظار صاحب کو مل جائے، میں بھی اپنی آنکھوں سے یہ سب ہوتے دیکھ لوں......

لیکن یہ میری جذباتی خواہش ہے۔ منطقی طور پر میں جانتا ہوں کہ ایسا ہونا مشکل ہے، بہت مشکل۔

خود انتظار صاحب کو اس کی زیادہ پروا نہیں ہے، ہو جائے تو اچھا اور نہ ہو تو کوئی غم نہیں۔ یوں بھی میں نے اتنے عرصے میں انہیں کسی بات پر بے صبرا ہوتے نہیں دیکھا۔ ان کے مزاج میں ٹھہراؤ اور restraint خاصا ہے۔

یہاں آنے کی تیاری کرتے ہوئے میں نے یہ بات ان سے کہی بھی تھی کہ میرے اندازے میں اس بات کا امکان کم ہے۔ یہ نہیں کہ ادیب کے طور پر وہ کسی سے ہیٹے ہیں بلکہ یہاں ان کی صرف ایک ہی کتاب کا نام لیا جا رہا ہے۔ افسانوں کا بڑا اچھا مجموعہ ہے جو محمد عمر میمن نے ترجمہ کیا ہے، مگر اس سے یہاں لوگ

واقف نہیں ہیں۔ اگر باقی کے ناول بھی انگریزی میں موجود ہوتے اور مزید افسانے تو انعام کے امکانات زیادہ بہتر ہوتے۔ باقی جو لوگ اس مرحلے میں موجود ہیں، ان کی تحریروں کی مقدار زیادہ ہے، سات آٹھ کتابیں اوسطاً۔ محض ایک ناول کے بل بوتے پر یہاں بات نہیں بنتی۔ مجھے تو یان لیانکے کے امکانات روشن لگ رہے ہیں۔ افسوس کہ میں اس سے براہِ راست کوئی گفتگو نہیں کر سکتا۔

تقریب شروع ہونے میں چند گھنٹے بھی نہیں رہے۔ سارے دن کے بادلوں اور سرمئی، سرمئی سے موسم کے بعد دھوپ نکل آئی، خوب چمکنے لگی لندن کی دھوپ...... بارش کہاں، دن میں ہلکی بونداباندی ہوئی ہے۔ کہیں دھوپ کے ساتھ بارش نہ ہوتی رہے، یہ تو عجیب سا شگون ہوگا...... آج کی تقریب کے لیے میں شگون کیوں ڈھونڈ رہا ہوں، میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں۔

انتظار صاحب تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں۔

میں بھی یہاں اپنے کمرے میں ڈیسک پر بیٹھا ہوا کاپی میں یہ لکھ رہا ہوں۔ وقت دیکھتا جاتا ہوں، ابھی مُہلت ہے......

ٹی وی پر انٹرویو کرنے والوں کی طرح میں بار بار انتظار صاحب سے نہیں پوچھ رہا کہ آپ کو کیسا لگ رہا ہے۔ میں خود اپنے بارے میں نہیں بتا سکتا کہ کیا محسوس ہو رہا ہے۔ ذہن ٹی وی کا اسکرین بن گیا ہے جس پر سفید رنگ کی پٹی چل رہی ہے۔

یہ تقدیر ہے یا داؤ، جس کا فیصلہ پہلے سے کہیں ہو چکا ہے، طے کیا جا چکا ہے، مجھے نہیں معلوم۔ پھر بھی میں اس بازی کی آخری چال دیکھنے کے لیے چلا آیا ہوں اتنی دور سے۔

اب ذرا دیر میں کمرے سے نکلنا ہے۔ ان آخری لمحوں میں مجھے اور طرح کی گڑبڑاہٹ ہو رہی ہے۔ میری پتلون ڈھیلی تو نہیں لگ رہی ہے؟ بیلٹ کراچی میں تو نہیں بھول آیا؟ طبیعت تو نہیں خراب ہونے لگے گی؟ دوائیں اپنے ساتھ جیب میں رکھ لوں؟ سیکورٹی والے

تلاش تو ضرور لیں گے...... بس اب چل دینا چاہیے۔

چند قدم کا فاصلہ مگر پھر بھی ہمیں وہاں لے جانے کا بندوبست تھا......

وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم کی پُرشکوہ عمارت میں داخل ہو رہے ہیں اور گیلری سے گزر رہے ہیں جو مجسموں سے مزین ہے۔

''ارے یہ تو نیوڈ ہے'' انتظار صاحب چلتے چلتے ٹھٹھک جاتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگتا ہے مداخلت کرنے والے ہم ہیں اور یہ متناسب جسم والے مجسمے ہمیں بھی اتنے تعجب سے دیکھ رہے ہیں کہ کون آیا۔

میں ایک اور الماری کی طرف کھنچا چلا آتا ہوں اور اس کے سامنے پہنچ کر ٹھٹھک جاتا ہوں۔ تصویروں میں کئی دفعہ دیکھی ہوئی یہ امیج سامنے آ کر چونکا دیتی ہے۔ یہ میسور کا شیر ہے جو زمین پر گرے انگریز فوجی کو پھاڑ کھانے کے لیے منھ کھولے آگے بڑھ رہا ہے۔ ٹیپو سلطان کے دور کی یہ یادگار اس میوزیم میں رکھی ہوئی ہے اور محض ایک تاریخی کھلونے کی سی حیثیت رکھنے کے باوجود اپنی علامتی معنویت کی وجہ سے اپنے دیکھنے والوں کو حیرت میں مبتلا کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔

میں اس کو دیکھتا ہوں اور آگے بڑھ جاتا ہوں جدھر باقی لوگ جا رہے ہیں۔

بہت عمدہ لباس میں اور نک سک سے درست جوسپ نووا کووچ داخل ہوتا ہے اور بڑی سہولت کے ساتھ وہاں لوگوں میں گھل مل جاتا ہے۔ میں اسے کراچی لٹریچر فیسٹول کے بارے میں بتا رہا ہوں اور وہ بڑے انہماک سے سُن رہا ہے۔ ماری این ڈیائے اسی حلیے اور اسی انداز میں ایک طرف کھڑی ہے۔ اس کے ہاتھ میں خالی جام ہے اور وہ اکیلی ہے۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے میلے میں کھوئی ہوئی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر جذبات ہیں نہ کوئی توقع۔

There are too many prizes and too much attention to prizes.

باتوں باتوں میں وہ ایک بار پھر کہتی ہے۔

میں آگے جا کر یان لیانکے سے ہاتھ ملاتا ہوں۔ وہ ''دنیا زاد'' کا شمارہ الٹا پکڑ کر دیکھتا ہے جس میں اس کی دو تحریریں شامل ہیں۔ میں اسے بتاتا ہوں ـــــ مترجم کے ذریعے ـــــ کہ میرے ایک دوست نے اس کی تحریر کا ترجمہ کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس کے نام سے کسی طرح بھی منسلک ہونے کے بعد ممکن ہے کہ ان کو چین کا ویزا نہ مل سکے۔

یہ حکومت کچھ بھی کر سکتی ہے، وہ اپنے مترجم کے ذریعے سے جواب دیتا ہے۔

پھر جھک کر اپنے اردو مترجمین کے لیے شکریہ اور آداب پیش کرتا ہے۔ میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کیجیے، وہ ایک تفصیلی پیغام بھجوانا شروع کرتا ہے لیکن میری سمجھ میں اتنا ہی آتا ہے۔ باقی باتیں لوگوں کی آمد و رفت کے شور میں دب جاتی ہیں۔

لیڈیا ڈیوس سب سے آخر میں آئی ہیں۔ وہ پیدل چلتی ہوئی آ رہی ہیں، اس لیے باہر کے موسم کی وجہ سے ان کے ہاتھ اور چہرہ ٹھنڈے ہیں۔

وہ گرم جوشی سے ملتی ہیں۔ ''میرا کوئی امکان نہیں ہے اس لیے میں بہت سکون سے ہوں۔'' وہ مجھے بتانے لگتی ہیں۔ آج میں نے پروست کے ناول کی پہلی جلد حاصل کر لی جس کا انہوں نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ اس پر دستخط کر کے پوچھتی ہیں، آج تو تمہارا نام غلط نہیں لکھا؟

''نام بالکل صحیح ہے،'' میں انہیں بتاتا ہوں اور وہ ہنس پڑتی ہیں۔

ہم ہال کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ ڈنر ٹیبلز پہلے سے مختص کی ہوئی ہیں اور ہال میں داخلے کے وقت ہمیں اپنی نشست بتائی جاتی ہے۔

میں اپنی جگہ تلاش کر رہا ہوں جو سیدھے ہاتھ کی جانب ہے۔ اتنے میں وہ لڑکی میرے پاس آتی ہے اور جھک کر کان میں کچھ کہتی ہے، میں چونک جاتا ہوں۔

''تمہیں معلوم ہے یہ انعام کون جیتنے والا ہے؟'' وہ پوچھتی ہے۔

کون؟ میں تعجب سے پوچھتا ہوں۔

میرے شہر کے فلاں اخبار نے دو گھنٹے پہلے خبر leak کر دی۔ ان کی ویب سائٹ پر
آ گیا ہے۔ مجھے فون بھی آ رہے ہیں۔ It's Lydia Davis۔

ایک حیرت کے ساتھ میں سُنتا ہوں۔ پھر جیسے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔

کسی کو مت بتانا، وہ انتباہ کرتی ہوئی اپنی جگہ واپس چلی جاتی ہے۔ ایک کرسی چھوڑ کر
انتظار صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ فیصلہ ہو بھی چکا، میں نے ابھی ابھی یہ سُنا ہے۔ میں ان سے
کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ظاہر ہے فیصلہ تو ہو چکا ہوگا، وہ اسی طرح بیٹھے رہتے ہیں۔ مجھے کوئی فکر نہیں۔ مجھے خیال
اپنے دوستوں کا آ رہا ہے وہ جو امید لگائے بیٹھے ہیں۔ میں نے صبح بھی فون پر لاہور کے
دوستوں سے کہہ دیا تھا زیادہ excited نہ ہوں! وہ کہتے ہیں۔

میں اپنی مقررہ جگہ واپس آ جاتا ہوں۔ میرے لیے اس پوری شام کا طلسم ایک لمحے میں
ٹوٹ گیا اور اب اپنے آپ کو compose کر کے بیٹھے رہنا بھی کارِ دارد۔

میرے برابر ایک نوعمر خاتون بیٹھی ہیں۔ ناموں کے تبادلے کے بعد میرے ملک کا نام
سن کر ان کی آنکھیں پھیل جاتی ہیں لیکن ایک لمحے کے لیے۔ پھر وہ مجھے اپنی پسند کے لکھنے
والوں کے بارے میں بتاتی ہیں اور پوچھتی جاتی ہیں کہ میں نے آج موجود لوگوں میں سے کن
کن ادیبوں کو پڑھ رکھا ہے۔ اسی ذکر میں عافیت ہے۔

اس تقریب میں شریک لوگوں میں راشد اشرف صاحب اور دردانہ انصاری بھی ہیں،
عامر حسین اور امینہ سیّد بھی۔ سب الگ الگ جگہوں پر ہیں۔ عامر حسین بہت پُر جوش ہیں کہ وہ
فلسطین کے ادبی جشن میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں۔ اس پروگرام کے بارے میں انھوں
نے بتایا کہ فلسطین کی حوصلہ مند ثقافت کا آئینہ دار ہے، جو کہیں بھی محض سیاہ اور سفید نہیں رہتی۔
اس مرتبہ لندن کے سفر میں عامر سے ملاقات اس وجہ سے محدود رہ جاتی ہے۔

اس مقام سے کوئی مقدس روح گزر رہی ہے، جیسے روحیں بلانے کا عمل کرنے والے بلند آواز سے پکارتے ہیں ــــــ عامر حسین کی آواز مجھے اسی طرح سنائی دے رہی ہے جب وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آتے ہیں اور سرگوشی کے انداز میں کہتے ہیں۔ وہ اس طرف اے ایس بائیٹ بیٹھی ہوئی ہے۔ تم اس سے جا کر مل کیوں نہیں لیتے؟

مگر میں اسے نہیں جانتا، میں اس نام پر چونک اٹھتا ہوں۔

عامر حسین تعارف کراتے ہیں تب میں ان سے دو چار باتیں کرتا ہوں۔ میں نے آپ کی تازہ ترین کتاب جو پڑھی، وہ Elementals ہے جو مجھے بہت پسند آئی۔ پھر میں اس کتاب کا نام یاد کرتا رہ جاتا ہوں جس میں ناولوں کے بارے میں ان کی طویل گفتگو شامل ہے۔ مگر آئرس مرڈاک پر آپ کی کتاب بہت عمدہ ہے، میں اس کتاب کو خاص طور پر یاد کرتا ہوں۔

وہ میری طرف کچھ غور سے دیکھتی ہیں۔ پھر بتانے لگتی ہیں کہ وہ کتاب انہوں نے کیسے لکھی۔

مجھے آئرس کے ناول بہت پسند تھے۔ میرا ایجنٹ بھی وہی تھا جو آئرس کا ایجنٹ ہوا کرتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ کچھ مختصر سا لکھوں گی، لیکن پھر یہ اتنی موٹی کتاب بن گئی...... میں طالب علم تھی جب A Severed Head کسی نے پڑھنے کے لیے دی تھی۔ تب سے وہ مجھے پسند ہے۔

مگر مجھے اس کے شوہر کی کتاب پسند نہیں آئی۔ اسے یہ سب بیان کرنے کی ضرورت تھی، اپنے لیے۔ آئرس کے لیے نہیں۔

اب لوگوں کو ایک کہانی مل گئی ہے۔ اس کے ناولوں کو پڑھنے سے پہلے یہ کہانی دُہرائیں گے۔

اور میں نے وہ فلم بھی نہیں دیکھی۔ اس کی اداکارہ کو میں پہلے سے جانتی تھی، اور اس کی آواز کے ساتھ آئرس کا تصور نہیں کر سکتی۔

تقریب کے بعد وہ ہم سے پھر باتیں کرنے لگتی ہیں۔ باتیں کرتے کرتے ان کو کچھ یاد آتا ہے۔ میں اپنا موبائل گھر بھول آئی ہوں، ٹیکسی آ گئی تو مجھے پتہ کیسے چلے گا؟ وہ مڑ کر کسی کو

ڈھونڈنے لگتی ہیں۔

کھانا ختم ہو چکا تو اتنے میں کچھ ہلچل سی ہوئی، دو ایک آوازیں آئیں، سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھنے لگے، لوگوں نے کھنکھار کر گلے صاف کیے۔ مجلس منصفین کے صدر، سر کرسٹوفر رکس سامنے آئے۔ انہوں نے مائیکروفون پر انعام کے حق دار کا نام پکارا ___ اور وہ ہے لیڈیا ڈیوس!

ہال میں تالیاں بجیں۔ دو چار نے نعرے بھی لگائے مگر دھیمے انداز میں۔

تالیوں کی گونج میں لیڈیا ڈیوس اسٹیج پر آتی ہیں۔ سارے کیمرے اسی طرف ہیں اور دیواروں پر نصب روشنیوں کا رُخ ان کی جانب ہے۔

سر کرسٹوفر رکس اپنی تعارفی تقریر میں پہلے تو اس مرحلے کی فہرست کا ذکر کیا ___ The splendour of this list انہوں نے کہا، پھر لیڈیا ڈیوس کے فن کو سراہتے ہیں۔ وہ اس میں innovation اور imagination پر زور دیتے ہیں۔

لیڈیا ڈیوس کی جوابی تقریر مختصر ہے، ان کی کہانیوں کی طرح۔

وہ کہتی ہیں کہ ان کو یقین تھا کہ انعام ان کو مل نہیں سکتا اس لیے انہوں نے کوئی تقریر پہلے سے تیار کر کے نہیں رکھی۔ یہاں آنے کے لیے وہ ٹیوب میں آرہی تھیں اور پڑھنے کے لیے اخبار نہیں ملا تو جو چند خیالات ذہن میں آرہے تھے، ان ہی پر اکتفا کریں گی۔

I haven't prepared anything. I am short of words.

It was enough to be a finalist. I am very honoured، انہوں نے کہا to be in their company.

یہ بات مجھے بہت معقول لگی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور مزے دار بات کہی۔

It is wonderful to be a short story writer because fiction writing is often equated with writing novels.

(بعد میں میں نے ان سے کہا کہ یہ بات مجھے اردو کے حوالے سے بہت اہم معلوم ہوئی۔ انہوں نے فوراً اس کی تفصیل بھی دریافت کی۔)

مگر افسانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ترجمے کے حوالے سے بھی بات کی۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ ان کے کام کا بڑا اہم حوالہ ہے گو کہ میں اس سے برائے نام واقف ہوں۔ انہوں نے کہا کہ یہ انعام ترجمے کے حق میں نیک فال ہے۔

This should bring translators more into light.

بے حد مختصر گفتگو کے بعد وہ اسٹیج سے اتر آئیں اور مبارک باد دینے والے لوگوں سے ہاتھ ملانے لگیں جن میں، میں بھی شامل ہو گیا۔

لوگ اب ادھر ادھر ملنا ملانا کر رہے ہیں۔ عامر حسین اب Marina Warner سے تعارف کراتے ہیں، ممتاز ادیبہ جنہوں نے کتابیں تو بہت سی لکھی ہیں مگر میں نے ایک ہی پڑھی ہے اور اسی کی وجہ سے میرے لیے لائق صد احترام ہیں ــــ وہ ہے الف لیلہ پر ان کی کتاب Charmed States۔ وہ الف لیلہ سے اپنی دل چسپی کا حال انتظار صاحب کو اور مجھے بڑے مزے سے سنانے لگتی ہیں۔ مگر بہت سے لوگوں کے ہجوم میں اس سے زیادہ بات نہیں ہو پاتی۔ وہ بھی آگے بڑھ جاتی ہیں اور میں بھی کسی اور طرف کو چل دیتا ہوں۔

تقریب ختم ہو گئی۔ لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔

ابھی تصویر کھنچے گی، کسی کی آواز کان میں پڑتی ہے۔ شاید انتظار صاحب کو بھی وہاں جانا پڑے، میں رک جاتا ہوں۔

پاکستان کے ایک ٹیلی وژن چینل کا نمائندہ تاثرات رکارڈ کرنا چاہتا ہے اور بار بار مجھے فون کرتا ہے۔ سیکورٹی والے اسے روک دیتے ہیں تو وہ فون پر مجھ سے ناراض ہونے لگتا ہے۔

ہم وہاں سے نکلنے لگتے ہیں۔

باہر کے دروازے کے قریب ایک کونے میں آنتھ مورتی بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں ان کی بیٹی اور بیوی سے مل کر خدا حافظ کہہ رہا ہوں تو وہ مجھے اشارے سے اپنے پاس بلا لیتے ہیں۔

اگر انعام انتظار حسین کو مل جاتا تو مجھے اتنی خوشی ہوتی جیسے مجھے مل گیا ہے، وہ ایک بار پھر

دہراتے ہیں۔

لیکن یہ لوگ ہمیں برداشت نہیں کر سکتے۔ اتنی سی گنجائش بھی نہیں رکھتے۔ میں نے سر کرسٹوفر رکس سے جا کر شکایت کی ہے۔ ہماری زبانوں کے لیے جگہ نہیں بنانا چاہتے۔ یہ یورپ والے بہت چالاک ہیں، وہ افسوس سے سر ہلاتے ہیں۔ یہ وسیع پیمانے کے epic imagination کا اب تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اگر میرا نام آتا تو میری زبان کے لیے بڑی بات ہوتی۔ میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تو اپنا کام کر دیا، وہ کہہ رہے ہیں۔

جلدی چلو بھئی، سردی ہو رہی ہے۔ انتظار صاحب باہر سے آواز دے رہے ہیں۔ میں یہ بات ادھوری چھوڑ کر ہال کے باہر نکل آتا ہوں۔

باہر واقعی ہوا کے ہاتھ بہت سرد ہیں اور ناخن نکیلے۔

تھوڑی دور جانا ہے مگر میں کوٹ میں سمٹا سکڑا جا رہا ہوں۔

زیادہ بات چیت نہیں ہوتی۔ ہم اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو جاتے ہیں۔

دی مارننگ آفٹر۔ یعنی اگلی صبح۔

ہم نے ناشتہ کر لیا، اب بی بی سی جا رہے ہیں۔

یہ ہائیڈ پارک ہے، میں گاڑی کے شیشے میں سے اس طرف اشارہ کرتا ہوں۔

''کیا بات ہے!'' انتظار صاحب کہتے ہیں۔ ''سارا شہر سر سبز ہے۔ جتنی عمارتیں نہیں، اس سے زیادہ درخت ہیں۔ وہ اس سر سبز شہر کو بہت خوشی سے اپنی آنکھوں میں اُتار رہے ہیں۔

Zivilvi! جوسب نووا کووچ نے اپنی کتاب پر دستخط کرتے ہوئے ایک لفظ اپنی زبان کا لکھا تھا۔

اس کا مطلب کیا ہے، یہ بھی تو بتائیے، میں نے پوچھا۔

اس کا مطلب ہے زندہ رہو! اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

مگر آج مجھے وہ دوسرے ہی موڈ میں ملا۔

تم کراچی لٹریچر فیسٹی ول کا ذکر کر رہے تھے۔ مجھے تو نہیں بلاؤ گے اب مجھے انعام نہیں ملا، اس نے کہا۔

انعام ملے یا نہ ملے تم اہم لکھنے والے تو ہو ___ میں اس کو باور کرانے لگتا ہوں۔ مگر اس کے سپاٹ چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہے، جیسے اسے میری بات کا اعتبار نہ ہو۔

دوستوں کے تاثرات اور کمنٹ بھی سامنے آرہے ہیں۔

میں نے لیڈیا ڈیوس اور انتظار حسین کے ساتھ اپنی تصویر لگائی تو ایک دوست نے ٹکڑا لگایا، انتظار حسین کے چہرے پر ایک موہوم سا دکھ نظر آرہا ہے، نہ جانے کیوں؟

راشد اشرف صاحب نے فوراً جواب دیا، نہیں۔ بلا وجہ دکھ تلاش کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔ اس چہرے پر کوئی دکھ نہیں ہے۔ دل میں جو لاکھ دکھ ہیں ان کا واسطہ بکر پرائز سے نہیں ہے۔

حمید شاہد نے حسبِ دستور تفصیلی کمنٹ لکھا ہے۔ انور سن رائے نے جو لکھا ہے، ان کی بات میں وزن ہے۔

تقریب کے دوران جب بکر انعام حاصل کرنے والے، بلکہ والی کا نام پکارا گیا تو یان لیانکے میری اگلی ہی میز پر بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ چینی مترجم بھی تھی جو انعام کے ساتھ ملنے والی توصیفی سند کے الفاظ ان کو ترجمہ کر کے بتا رہی تھی۔ بعد میں مجھے لگا کہ وہ افسردہ اور ملول نظر آرہی ہے۔

میں نے اپنا یہ تاثر بعد میں دُہرایا تو میرے ایک دوست نے کہا، پچھلے سال چینی ادیب کو نوبیل انعام ملا تھا۔ اس لیے اتنا بڑا بین الاقوامی انعام چین کے کسی ادیب کو کیسے مل جاتا؟

گویا یہ بھی ملحوظِ خاطر رکھا گیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے

کہ اسے ماننے میں مجھے تامل تھا۔

اس میز پر کچھ چرغم ہو رہی تھی۔ شاید بھی لوگ یان لیانگ سے اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے تھے، بلند آواز چینی زبان میں۔ میں نے ادھر مڑ کر دیکھا تو مجھے ایسا لگا کہ یان لیانگ ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا تو اس نے ایک لفظ ادا کیا جو میری سمجھ میں آ گیا۔

''پاکستان'' اس نے کہا۔

اس پُل پر سے بار بار گزرے اور عمارتوں کے اس شان دار جُھرمٹ کو دیکھتے رہے جن میں ویسٹ منسٹر ایبے کسی نگہدار کی طرح سربلند نظر آتی ہے۔ پھر اس وقت جیسے عمارتوں کی شان شوکت نے میرے قدم روک لیے۔ میں ان کو دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ مگر مجھے اس وقت ورڈز ورتھ کی وہ نظم یاد نہیں آئی جو ہمیں اسکول میں پڑھائی گئی تھی کہ کرۂ زمین کے پاس دکھانے کے لیے اس سے زیادہ حسین منظر کوئی نہیں ہے۔ اِلیٹ کی وہ ''غیر حقیقی شہر'' والی سطریں میرے دماغ میں گونجنے لگیں۔ میں ان سطروں کو دھیان میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں اور انتظار صاحب سے باتیں بھی کرتا جا رہا ہوں۔ لندن کے یہ سارے مناظر وہ میرے ساتھ دیکھ رہے ہیں یا میں ان کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ معاً میں اس خیال سے چونک اٹھتا ہوں کہ اس نظارے سے گزرتے ہوئے یہ شہر میرا انفرنو تو نہیں اور وہ میرے ورجل — ابھی کچھ عرصہ پہلے ''نیویورکر'' کے کسی شمارے میں دانتے کے نئے ترجمے کا احوال پڑھا تھا جس میں سیر کرنے والے مسافر کو جب احساس ہوتا ہے کہ اس کا راہ نما اس کا استادِ معنوی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے:

Are you Virgil? Are you the spring, the well,

The fountain and the river in full flow

of eloquence that sings like a sea shell

Remembering the sea and the rainbow?

سمندر اور دھنک کی ایک یاد۔ فصاحت جس کے ترنم میں دریا موج زن ہے۔ ہاں، وہ

ورجل ہو سکتے ہیں، مگر میں کون سا ایسا مسافر ہوں۔ اور نہ میرا سفر خداوندی طربیہ
ادھورے پن کی ماری خواہش خام ہے، میرا رزمیہ بھی بن لکھا رہ جائے گا۔ یہ خیال مجھے پھر آیا جب
میں نے بعد میں جا کر کلائیو جیمز کے اس ترجمے میں وہ سطریں پڑھیں جہاں جہنم کے پھاٹک پ
چند نا قابلِ فراموش الفاظ ثبت ہیں:

To enter the lost city, go through me.
Through me you go to meet a suffering
unceasing and eternal. You will be
with people who, though me, lost everything.

My maker, moved by justice, lives above.
Through him, the holy power, I was made——
made by the height of wisdom and first love,
whose laws all those in here once disobeyed.

From now on, every day feels like your last
forever. Let that be your greatest fear.
your future is now to regret the past.
Forget your hopes. They were what brought you
here.

یہ الفاظ جیسے سہما کر رکھ دیتے ہیں۔ میرا کوئے ملامت ماضی نہیں، مستقبل ہے۔ کیا
امیدیں ہی دوڑائے لیے پھر رہی ہیں اور اس جہنم زار تک لے کر آئی ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا
ہوں مگر گڑبڑا کر رہ جاتا ہوں اور خیال کی ایک رو کے پیچھے اسی تیزی کے ساتھ دوسری رو اور پھر

تیسری رو اڑائے لیے جاتی ہے۔ میں یہ سب دیکھ لوں، پھر سوچوں گا۔

اگر یہ ممکن ہوا۔

برسوں پہلے جب میں پہلی بار لندن آیا تھا تو بش ہاؤس کا مطلب تھا بی بی سی۔ وہیں میں نے اردو سروس کا دفتر بھی دیکھا تھا۔ اس وقت زاہدہ حنا وہاں تھیں اور عبید صدیقی۔ اب بش ہاؤس کی عمارت ڈھنڈار معلوم ہوتی ہے۔ پرانے وقتوں کا ایک ہیولیٰ۔

جب میں اگلی بار اس شہر میں آؤں گا ___ جب کبھی ___ تو اس وقت یہ عمارت کوئی نیا منظر پیش کر رہی ہوگی، یہ شہر کراچی کی طرح نہیں ہے جس کے وسط میں بدروح ایسی کئی عمارتیں کھڑی رہ گئی ہیں...... نامکمل منصوبے، ماضی کی شان وشوکت، غیر موجودگی اور غیر حاضری کا ایک شہر......

مگر میں اس وقت بی بی سی کی نئی عمارت میں داخل ہو رہا ہوں...... لوگوں کا ہجوم...... کمرے اور کھلی جگہ میں میزیں جن کے حصے الگ الگ ہیں، لوگ انتہائی مصروفیت کے عالم میں آ رہے ہیں، جا رہے ہیں۔

کارِ دنیا۔

اردو سروس کی میزیں جہاں ہیں، کوئی ہمیں وہاں لیے جاتا ہے۔ "وزٹر" کا پلاسٹک کارڈ میں سینے پر آویزاں کر لیتا ہوں۔ مبادا کوئی پوچھ لے۔ میں اس بازار سے گزر رہا ہوں خریدار نہیں۔

وہاں موجود کئی لوگ ملنے کے لیے آتے ہیں۔ دو ایک کو میں غور سے دیکھتا ہوں۔ اچھا، ان کو تو میں کراچی میں پہچانتا تھا۔ امبر خیری ملنے کے لیے آئیں، وہ آج کل وہاں کام کر رہی ہیں۔ مہ پارہ صفدر جو ایک زمانے میں پاکستان ٹیلی وژن پر خبرنامے کا معروف چہرہ تھیں۔

اس پروگرام کی پروڈیوسر مہ وش حسین ہیں، وہ ہمیں اس طرف لاتی ہیں جہاں ندیم اسلم ایک بڑا سا تھیلا لیے ہمارے منتظر بیٹھے ہیں۔

بڑی مشکلوں سے اس پروگرام کا وقت نکالا گیا ہے۔ ندیم اسلم انتظار صاحب کا انٹرویو کریں گے۔ اس سال فروری کے کراچی لٹریچر فیسٹول میں ندیم اسلم نے غیر معمولی الفاظ میں انتظار حسین کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ اس وقت میں بھی اسٹیج پر موجود تھا اور اس خراجِ تحسین کو

...وں۔ اور نہ میرا سفر خداوندی طربیہ۔ یہ
...لکھا رہ جائے گا۔ یہ خیال مجھے پھر آیا جب
...سطریں پڑھیں جہاں جہنم کے پھاٹک پر

To enter the lost ...
Through me you...
unceasing and e...
with people wh...

My maker, m...
Through hin...
made by th...
whose law...

From no...
forever.
your fu...
Forget...
here.

...ستقبل ہے۔ کیا
...یں پوچھنا چاہتا
...سری رو اور پھر

آنسوؤں کے ساتھ سن رہا تھا۔ میرا دل ناظرین کی تالیوں کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔

ایک طرف ٹیرس کے سے انداز میں صوفے اور کرسیاں مہمانوں کے لیے موجود تھے۔ ہم وہیں بیٹھ گئے۔ انتظار صاحب کو والہانہ انداز میں سلام کرنے کے بعد ندیم اسلم نے اپنا تھیلا کھولا۔ ایک ایک کر کے وہ اس میں سے انتظار صاحب کی کتابیں نکال کر میز پر رکھتے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں میز پر ڈھیر لگ گیا۔

کتابوں پر جابجا نشان لگے ہوئے ہیں۔ بعض صفحوں کے کونے موڑے گئے ہیں، بعض پر رنگین نشانیاں رکھی ہوئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان کتابوں کو خوب پڑھا گیا ہے۔

وہ ان کتابوں پر دستخط کرانے کے لیے لائے ہیں۔

انتظار صاحب ہنستے ہیں اور کچھ کہے بغیر دستخط کرنے لگتے ہیں۔ تمام کہانیوں کے یک جلدی مجموعے کی کاپی الگ نظر آ رہی ہے۔ اس کا پشتہ دوبارہ چپکایا گیا ہے۔ ''اس کی جلد کو میں نے خود جوڑا ہے۔ کسٹم والے موٹی کتابوں کی جلد کاٹ لیتے ہیں۔ ان کو خطرہ ہوتا ہے کہ لوگ اس میں ہیروئن بھر کر نہ لا رہے ہوں۔ اور لوگ لاتے بھی ہیں۔ ایسا نہیں کہ لاتے نہیں ہیں...... انہوں نے اسے بھی کاٹ دیا تھا۔ پھر میں نے گوند لگا کر جوڑ لیا.....'' وہ اس مجموعے کی روداد ہمیں سنا رہے ہیں۔

باتیں کرتے کرتے ندیم اسلم ان میں سے ایک کتاب کو کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ یہ انتساب کا صفحہ ہے، ''گم شدہ ہم سفروں کے نام۔'' وہ اس کی طرف اشارہ کر کے بتانے لگتے ہیں، میری کتاب کا نام ہے Maps for Lost Lovers۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں اس کا نام کہاں سے لیا، یہ کس کی لائن ہے۔ آپ نے اپنی کتاب کا انتساب کیا ہے، وہیں سے یہ نام آیا ہے، گم شدہ ہم سفروں کے لیے نقشے، وہ بتانے لگتا ہے اور پھر باتوں کے دوران اسی طرح انٹرویو ریکارڈ ہو جاتا ہے۔

نہ اسٹوڈیو کی ضرورت ہے نہ اہتمام کی۔

اہتمام صرف promo کا ہونا ہے جس میں انتظار صاحب کو ندیم اسلم کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بی بی سی کے شیشوں والے گھومتے دروازے سے اندر آتا ہوا دکھایا گیا ہے۔

انتظار صاحب چھڑی ایک کونے میں رکھ دیتے ہیں اور ندیم اسلم کے ساتھ عمارت میں داخل ہونے لگتے ہیں۔ کیمرہ پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے اور دیوار کے ساتھ ٹکی ہوئی چھڑی یوں لگتا ہے کہ شیشوں کی عمارت کو سہارا دے رہی ہے کہ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو۔

انٹرویو بھی ختم ہوا، پروگرام کے اشتہار کی شوٹنگ بھی لیکن ندیم اسلم سے مکالمہ ابھی جاری ہے۔ طے یہ ہوا کہ ہم کھانا ساتھ کھائیں گے۔ حالاں کہ ابھی وقت نہیں ہوا تھا اور ندیم اسلم نے اپنے پسندیدہ کسی ہوٹل کی نشان دہی بھی نہیں کی۔ ہم کنسنگٹن میں اسی طرف آگئے جہاں ہم روزانہ کھانا کھا رہے ہیں اور دنیا گول ہے کہ مصداق، دیس دیس کے کھانوں کو چھوڑ کر انتظار صاحب ہندوستانی کھانا تلاش کر چکے ہیں۔

ہندوستانی کھانا جس کے کھانے والے زیادہ تر انگریز ہیں اور سروس فراہم کرنے والے بنگلہ دیشی۔

"تُمار باڑی کوتھائے؟" میں یوں ہی رعب جھاڑنے کے لیے بیرے سے پوچھتا ہوں جو بڑے اہتمام کے ساتھ مینو کارڈ ہمارے سامنے رکھ رہا ہے۔

"سلہٹ" وہ جواب دیتا ہے، پھر نیم سرگوشی کے انداز میں کہتا ہے میں یہاں پانچ سال سے ہوں، آپ ہماری مینگولسی ضرور ٹرائی کریں۔

مینگولسّی کا تصور ہم میں سے کسی کو نہیں بھاتا۔ اس وقت جتنی شیرینی موجود ہے وہ ندیم اسلم کی بے حد دل چسپ باتوں میں پہلے سے موجود ہے اور اس وقت تک موجود رہتی ہے جب وہ ہوٹل کے دروازے پر ہم سے رُخصت ہوتے ہیں اور کانوں پر آئی پوڈ چڑھا کر ٹیوب کے ہجوم میں گم ہو جاتے ہیں۔

انتظار صاحب کے ہاتھ میں چھڑی کے ساتھ ندیم اسلم کا نیا ناول بھی ہے جو ان کو تحفے میں ملا ہے۔ ایک اور ہدیۂ عقیدت۔

دھوپ کے رنگ صبح سے واضح تھے۔ انتظار صاحب نے مجھے فون کیا ناشتے کے لیے۔

مگر ابھی تو سات بجے ہیں۔ ابھی تو وہ کونے والی بیکری بھی نہیں کھلی ہوگی۔

ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ بیکری کھل گئی ہے۔ ہم اس کے پہلے گاہک نہیں ہیں۔

ہم باہر نکلتے ہیں تو دھوپ کے ساتھ سیلی ہوئی ہوا۔

ریسپشن والا لڑکا ہمیں باہر نکلتے دیکھ کر حسبِ عادت سلام کرتا ہے۔ آج بارش ہوگی، گیارہ بجے کے بعد۔ کوٹ پہن لیجیے، وہ مجھ سے کہتا ہے۔

الٹے پیروں میں واپس جاتا ہوں، بھاری اوورکوٹ سے لدا پھندا آتا ہوں۔

لیکن بارش نہیں ہوئی اور کوٹ سارا دن کندھے پر جھولتا رہا۔

دھوپ کے باوجود سارا دن خنکی اور ہوا۔

لندن کے موسم بھی عجیب رنگ کے ہیں۔

ٹیکسی آ گئی ہے۔ سوٹ کیس اتار لیے گئے ہیں۔ اب پیڈنگٹن کے اسٹیشن سے ٹرین پکڑنی ہے اور سفر کا اگلا مرحلہ۔

اس اگلے مرحلے کو پُرسہولت بنانے میں ایک اجنبی لڑکی کا بھی شکریہ مجھے ادا کرنا چاہیے۔

میں نے پلیٹ فارم کا نمبر پتہ کیا اور وہاں اپنے سامان کے ساتھ ہم براجمان ہوگئے۔ انتظار صاحب کے ساتھ سوٹ کیس رکھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی ٹوپی اور چھڑی سے مسلّح ہیں۔ مجھے ان کے برابر جگہ نہیں ملی، میں دو بنچز کے فاصلے پر ہوں۔

وردی میں ملبوس وہ لڑکی ایک طرف سے آئی اور اگر اس نے رک کر انتظار صاحب سے بات نہ کی ہوتی تب بھی میں اس کو نظر بھر کر ضرور دیکھتا۔

''آپ ٹھیک ہیں؟'' وہ ان سے پوچھ رہی ہے مگر اس کا لہجہ ایسا ہے کہ مجھے بیچ میں بولنا پڑا کہ میں ان کے ساتھ ہوں۔

''ان کو وہیل چیئر دی گئی تو کیا یہ بُرا مان جائیں گے؟ آپ کے پاس سامان زیادہ ہے۔ میرے ساتھ ادھر آیئے......'' اس نے مجھ سے کہا۔

جس طرف دفاتر کے کمرے تھے، میں اس طرف چل پڑا۔ ''میں ابھی آتا ہوں، آپ

بیٹھے رہیے......'' میں انتظار صاحب سے کہتا ہوں۔

''آپ یہیں رہیے......'' وہ دُہراتی ہے۔

''میں پھر چونک جاتا ہوں۔ ''مگر آپ کا نام تو......'' میں اس کے کوٹ پر لگا ہوا نام دیکھ چکا ہوں۔

''میں پاکستانی ہوں۔ مجھے لوگ ایرانی یا ٹرک سمجھتے ہیں......'' وہ ہنستی ہے۔ اس نے ہمارے لیے اسپیشل اسسٹنس کا بندوبست کرادیا، یہاں پر بھی اور جدھر ہمیں ٹرین بدلنا تھی۔

''گھر میں میری امی ہیں۔ ان سے بھی کوئی وہیل چیئر کا کہہ دے تو بہت ناراض ہوتی ہیں......'' وہ جاتے جاتے اپنی بات انتظار صاحب کو سمجھاتی ہے، پھر آتی جاتی ٹرین کے ہجوم میں دفعتاً غائب۔ کوئی نہ کوئی سامان لے جانے اور صحیح ڈبا تلاش کرنے میں ہماری مدد کے لیے آجاتا ہے یہاں تک کہ ٹرین ایک آہستہ سے دھچکے کے ساتھ چل پڑتی ہے اور تیزی سے بھاگتا ہوا لندن پیچھے رہ جاتا ہے۔

پیڈنگٹن اسٹیشن والی لڑکی کے حق میں کلمۂ خیر انتظار صاحب نے تب کہا اور خاص طور سے جب چند منٹ کے فرق سے ہماری ٹرین چھوٹ گئی۔

ایک چھوٹے سے قصباتی اسٹیشن پر ہم اُتر گئے لیکن جس اگلی گاڑی میں ہمیں سوار ہونا تھا وہ جاچکی تھی۔ اس لڑکی نے خصوصی معاونت کے جس دفتر کا پتہ بتا دیا تھا، وہ پھر کام آیا۔ وقفے کی یہ مدّت ہم نے ویٹنگ روم میں آرام سے گزاری۔

ریل کا منظر بدلا اور پھر زبان بھی بدل گئی۔

مکانوں کی جگہ کھلے کھیت، ان میں چرتی ہوئی بھیڑیں، گھاس سے بھرے ٹیلے، سرسبز قطعے۔ لیکن ان سب سے زیادہ حیران کن ریل میں کیے جانے والے اعلانات جن میں سے ایک لفظ بھی پلّے نہیں پڑ رہا تھا۔ اوہو، تو یہ ویلشن زبان ہے۔ انگریزی سے بالکل مختلف۔ اعلان بھی اس میں تھے اور بعد میں اسٹیشن پر بھی یہ زبان لکھی ہوئی نظر آئی، اور اس کے ساتھ ہی انگریزی عبارت۔

چھوٹا سا اسٹیشن جس پر ساری چہل پہل لگتا ہے ٹرین کے آنے سے ہے ورنہ کچھ اور نہیں۔ ہمیں وہاں اترنا تھا۔

خدا معلوم کیا گھپلا تھا۔ ریل جب چھوٹ گئی تو جن کو اسٹیشن پر آنا تھا وہ بھی غائب ہوگئے۔ ہلکی بارش کے ساتھ سردی بڑھتی جارہی تھی۔ ہم نے اپنی منزل کا نام لیا تو اس نام کا پٹے کارڈ اٹھائے ہوئے خاتون نے گاڑی میں جگہ بنا دی۔ وہ کولوبیا سے آنے والی ایک صحافی خاتون کو ان کے ٹھہرنے کی جگہ چھوڑنے کی غرض سے آئی تھیں، لیکن ان خاتون نے فوراً اعلان کردیا کہ آج شام کو چین کے Dissident ادیب کے ساتھ سیشن ہے جس میں ان کو ہر حال میں پہنچنا ہے۔ گاڑی گھومتی ہوئی، بل کھاتے راستوں سے گزرتی ہوئی ان کو وہاں پہنچانے چلی جہاں ان کو ٹھہرنا تھا۔ ہرے بھرے درختوں میں گھرا پرانی وضع کا ایک بے حد حسین مکان جو یہاں کے کسی متموّل خاندان کی ملکیت ہے، خاتون ڈرائیور نے بتایا۔ اس علاقے کے تمام بڑے لوگ فیسٹول کے دنوں میں مہمانوں کو اپنے گھروں میں ٹھہراتے ہیں۔ بعض تو ایسے بھی ہیں جو مکان کرائے پر چڑھا کر چھٹیاں گزارنے، گھومنے چلے جاتے ہیں۔

راستہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ مگر انتظار صاحب اب تھک گئے ہیں۔ یہ راستہ ہے یا شیطان کی آنت؟ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا وہ پوچھنے لگتے ہیں۔

میں خاتون ڈرائیور کی بات سُن رہا ہوں جو مقامی ہے اور اس علاقے کی تفصیل بتا رہی ہے، خاص طور پر یہ کہ Hay فیسٹی ول کیسے شروع ہوا۔ یہاں کا ایک مقامی بادشاہ بھی ہے، پرانے حکم رانوں کی اولاد۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر طے کیا کہ ایسا کیا کاروبار اختیار کیا جائے کہ یہاں ترقی ہو۔ بہت سوچ کر اس نے پرانی کتابوں کی دکان کھولی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ قصبہ پرانی کتابوں کی ان دکانوں کے لیے مشہور ہوگیا۔ یہ فیسٹول بھی مقامی اسکول میں ایک چھوٹے سے پروگرام کی حیثیت سے شروع ہوا تھا۔ بڑھتے بڑھتے آج دنیا کا سب سے بڑا ادبی جشن بن گیا۔

لیجیے صاحب ہم اس کے مہمان بن کر یہاں بھی پہنچے۔

ڈرائیور خاتون کی زبان اور گاڑی اس وقت رُکے جب ہم منزل تک پہنچے، اس شام کی منزل۔ ہے (Hay) میں تو جگہ تھی نہیں، ہمیں بریکن نام کے قصبے میں ٹھہرایا گیا تھا جو بیس منٹ کے لگ بھگ فاصلے پر واقع ہے۔ پرانے انداز کی سرائے سی جو تمام جدید سہولتوں سے مزین تھی۔ انتظار صاحب آرام کرنے چلے گئے تو میں اس یکسر خاموش قصبے کی پتھریلی سڑک پر اکیلا پیدل مسافر بن کر نکلا اور قدیم چرچ ٹاور کے ساتھ نصب پتھر پر تاریخیں پڑھتا گیا۔ چھوٹی چھوٹی کئی دکانوں اور شام گئے تک کھلنے والے شراب خانوں پر شعلہ اگلتی سبز و سرخ ڈریگن کی علامت آویزاں تھی جو اس قصبے کی خاص نشانی تھی۔ صدیوں پہلے کسی بزرگ نے ـــــ کوئی سینٹ رہے ہوں گے ـــــ یہاں ڈریگن کو تہہ تیغ کیا تھا۔

یہ سینیٹ اور ڈریگن بھی بہت غنیمت ہیں۔

وہ نہ ہوتے تو پھر قصبے والوں کو کوئی اور مخصوص علامت ڈھونڈنا پڑتی۔

ٹروڈا کا میسیج آ گیا۔ صبح کے وقت گاڑی آ جائے گی جو ہم کو فیسٹول کی جگہ لے جائے گی اور بعد میں یہاں پہنچا بھی دے گی۔

ہم نے بہت سکون سے ناشتہ کیا ـــــ لیکن کیا وہی علی الصباح۔ انتظار صاحب لندن میں بھی آداب سحر گاہی کی خلاف ورزی پر آمادہ نہ ہوئے اور یہاں بھی نہیں۔

ٹروڈا تو اپنے بال بچوں سمیت یہاں آ گئی ہے۔ فیسٹول کے بعد چھٹی منائے گی۔ اس لحاظ سے یہ علاقہ بہت آئیڈیل ہے۔ دور تک سرسبز سکون......

فیسٹول کیا ہے، میدان میں خیموں کا شہر بسا لیا گیا ہے۔ ہم سے کہا گیا، گرین روم میں چلیے۔ گرین روم ایک بڑا سا خیمہ ہے جس میں ادیبوں کے بیٹھنے، باتیں کرنے، کھانے پینے کا انتظام ہے۔ ایک کونے میں وائی فائی کی سہولت ہے اس لیے بہت سے لوگ کمپیوٹروں پر بیٹھے کام کر رہے ہیں۔ چائے کافی وافر مقدار میں ہیں اور ان کو پیش کرنے والے نوجوان لڑکے لڑکیاں بڑی پھرتی کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

انتظار صاحب اور میں گرین روم کے اندر آتے ہیں تو سامنے ہی ایک صوفے پر ماری این ڈیائے بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی ہے۔ وہ پھر چپ چاپ اور سب سے الگ ہے۔ میں اس کے سامنے جا کر ہیلو کہتا ہوں تو وہ اچانک بہت خوش ہو کر ملتی ہے۔

میں کافی لے کر آتا ہوں اور ہم بیٹھے ہی ہیں کہ سامنے سے لیڈیا ڈیوس آ رہی ہیں۔ میں ان سے بھی ہیلو کرتا ہوں، وہ حال چال پوچھنے لگتی ہیں۔ انعام کی تقریب کے بعد ان سے پہلی ملاقات ہے مگر ان کا وہی تپاک ہے، اور اسی بے تکلف انداز میں باتیں کر رہی ہیں۔ میں ان کو بتاتا ہوں کہ فیس بک پر میری پوسٹ کے بعد اس انعام کے بارے میں دوستوں کے تبصرے آ رہے ہیں۔

پاکستان سے؟ وہ پوچھتی ہیں۔

میں بتاتا ہوں کہ جو مٹھی بھر کہانیاں اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں ان کی بناء پر بعض لوگ آپ کو شاعر قرار دے رہے ہیں، افسانہ نگار کے بجائے۔

بہت اچھا، وہ خوش ہو کر کہتی ہیں۔ مجھے اس طرح کی بحث ٹھیک لگتی ہے۔

ہم خیموں خیموں گھومتے ہیں، فوڈ کورٹ بھی دیکھتے ہیں، سووینیرز کی دکان بھی اور کتابوں کی بڑی سی دکان بھی۔ فیسٹول کا پروگرام کیا ہے، پوری کتاب ہے جس کے ہر صفحے پر ایسی تفصیلات ہیں کہ دامنِ دل کھنچا چلا جاتا ہے۔ ہم واپس گرین روم میں آن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ سامنے ایک میز پر تازہ اخباروں کا ڈھیر لگا ہے، کئی اخباروں نے فیسٹول کے لیے خصوصی اشاعت تیار کی ہے یا ضمیمے نکالے ہیں۔ میں ان کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ پڑھنے کو بہت کچھ ہے۔ انتظار صاحب کو ایک مضمون بہت دل چسپ لگ رہا ہے اور وہ مجھے اس کے بارے میں بتانے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی ہمیں لینے آ جاتا ہے، ریڈنگ کا وقت ہو رہا ہے۔

یہ پروگرام جو اس وقت ہونے جا رہا ہے، انتظار صاحب، ماری این ڈیائے اور لیڈیا ڈیوس کی ریڈنگ پر مشتمل ہے۔

ہم اس خیمے کی طرف جانے لگتے ہیں۔

لیڈیا ڈیوس میرے ساتھ چل رہی ہیں۔ آپ کیا پڑھنے والی ہیں، میں ان سے پوچھتا ہوں۔

آنے والی کتاب میں سے، وہ فولڈر دکھاتی ہیں۔ یہ کتاب ۲۰۱۴ء میں شائع ہوگی۔

کیا آپ 'جو ہے' پڑھ سکتی ہیں یا پھر ''پرنانیاں''۔ میں ان سے فرمائش کر بیٹھتا ہوں۔

وہ کیوں؟ تمہیں یہی کیوں پسند ہیں؟ مگر میرے پاس تو اس وقت یہی ہیں، وہ کندھے اچکا کر مجبوری ظاہر کرتی ہیں۔

اتنی دیر میں ہم راہداری طے کر کے ایک نئے خیمے میں آجاتے ہیں۔ پروگرام کے ناظرین باہر قطار بنائے کھڑے ہیں۔

یہ خیمہ کیا ہے، اچھا بھلا کمرہ سا ہے۔ اس کی چھت پر ستارے لگے ہوئی ہیں اور روشنی میں دمک رہے ہیں۔ اس تاروں بھرے آسمان کی چھت کے نیچے اسٹیج پر ماری این ڈیائے، انتظار حسین اور لیڈیا ڈیوس کرسیوں پر بٹھائے جاتے ہیں۔

پہلے ماری این ڈیائے آتی ہیں۔ وہ ناول کا اقتباس فرانسیسی میں پڑھتی ہیں اور اس کے پیچھے اسکرین پر اس اقتباس کا انگریزی ترجمہ ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔

اسی طرح انتظار صاحب اردو میں پڑھتے ہیں۔ اس پورے خیمے میں شاید اردو کی پڑھنت سے لطف لینے والا اکیلا میں ہوں۔ مگر ٹروڈا نے گھبرا کر مجھ سے کہا، کہ ملٹی میڈیا اسکرین سنبھال لوں۔ جوں جوں انتظار صاحب اردو میں پڑھتے جائیں انہی سطروں کو میں اسکرین پر دکھاتا جاؤں۔ میں ایک طرف کمپیوٹر پر بیٹھا ہوا انتظار صاحب کے الفاظ غور سے سن رہا ہوں اور ان کے متوازی انگریزی متن کو اسکرین پر پروجیکٹ کرتا جاتا ہوں۔ نئی سطر ابھر کر سامنے آتی ہے تو پرانی سطریں اسکرین کے اوپر سے بہہ کر جیسے فضاؤں میں بکھر جاتی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ انتظار صاحب کے الفاظ اُڑ اُڑ کر ان چمکتے ہوئے ستاروں میں شامل ہوئے جارہے ہیں اور میں ان الفاظ کو ستاروں سے بھی آگے چمکتے دمکتے دیکھ رہا ہوں۔

پھر تالیوں کی گونج میں انتظار صاحب کتاب بند کر کے اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں اور میں چونک کر واپس اپنی جگہ آجاتا ہوں۔ میں یہاں ہوں، مہ و انجم کی محفل میں نہیں۔

پروگرام کے آخر میں لیڈیا پڑھنے کے لیے آتی ہیں اور اپنی نئی کہانیوں میں سے پڑھتی ہیں۔ میرے لیے یہی بہتر ہے کہ میرے لیے یہ کہانیاں بالکل نئی ہیں، ان سنی اور ان جانی۔

تینوں پڑھنے والوں کا تعارف فیو مانا نے کرایا تھا اور میں نے نوٹ کیا کہ اس نے لیڈیا ڈیوس کے لیے پھر Original and innovative کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

سننے والوں کا ہجوم ایک ترتیب کے ساتھ رخصت ہونے لگتا ہے تو ہمیں باہر لے جایا جاتا ہے، کتابوں پر دستخط کے لیے۔ ایک بڑا سا خیمہ لگا کر کتابوں کی دکان سجا دی گئی ہے۔

خیمے کے پچھلے حصّے میں تین میزیں رکھی ہوئی ہیں۔ تین ادیب اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور کتابوں پر دستخط کرتے جاتے ہیں۔ کتابیں خریدنے والے شائقین قطار باندھے کھڑے ہیں۔ خیمے میں خوب رونق ہے، تصویریں کھینچی جا رہی ہیں، خریداروں کی ریل پیل ہے اور میں بھی کافی کا پیالہ ہاتھ میں لیے گھوم رہا ہوں۔

ریڈنگ ختم ہونے کے بعد آج شام کے مہمان تینوں ادیبوں کو لمبی شاخ کے ساتھ گلاب کا سفید پھول پیش کیا گیا تھا۔ لیڈیا ڈیوس اپنے حصّے کا پھول بڑی نزاکت کے ساتھ انگلیوں میں اٹھائے چل رہی ہیں۔

وہ میز کی طرف آتی ہیں، پھول ترچھا کر کے رکھتی ہیں پھر دستخط کرنے بیٹھ جاتی ہیں۔ بلکہ ان سے دستخط کرانے والوں کی تعداد دیکھتے ہوئے یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس کام میں جٹ جاتی ہیں۔

میرا جی چاہ رہا ہے کہ اس پھول پر آپ سے دستخط کرالوں، میں ان سے کہتا ہوں۔ کتاب پر تو میں دستخط پہلے ہی کرا چکا تھا۔

وہ پھول کو دیکھتی ہیں اور ہاتھ سے قلم بنا کر بڑی روانی کے ساتھ گھمانے لگتی ہیں۔

The unsigned Flower، میں ان سے کہتا ہوں۔ وہ ہنس پڑتی ہیں۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھتی ہیں اور برابر کی میز پر بیٹھے ہوئے انتظار حسین کے سامنے قطار میں کھڑی ہوجاتی

ہیں۔ میرے لیے ایک کاپی پر دستخط کر دیں، وہ ''بستی'' کا ایک نسخہ خرید کر انتظار صاحب کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔

انتظار صاحب دستخط کر رہے ہیں، دکان کے منتظمین تو شاید موقعے کی تلاش میں تھے۔ فوراً کیمرے نکل آئے، تصویریں کھینچنے لگیں۔

ہم کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے خبروں میں کیا چل رہا ہے؟ ٹروڈا مجھ سے پوچھتی ہیں۔

میں بتاتا ہوں کہ ریڈنگ کے باہر کیا ہو رہا ہے، مجھے نہیں پتہ۔ میں نے کتنے ہی دن سے ٹی وی نہیں دیکھا، اپنے ملک کا اخبار ضرور نیٹ پر دیکھ لیتا ہوں۔ وہ بھی دو دن سے نہیں دیکھا۔

لندن میں ایک فوجی کو چھریوں کے وار سے مار ڈالا گیا ہے۔ پتہ چلا ہے کہ مارنے والا مسلمان تھا۔ اخباروں میں شور مچا ہوا ہے، وہ مجھے بتاتی ہے۔

خدا رحم کرے! میں حیران ہو جاتا ہوں۔

مجھے کئی دن سے اپنے ملک کی تفصیل بھی نہیں معلوم۔ لگتا ہے خاموشی سی چھائی ہوئی ہے۔ ایک حکومت کے جانے اور دوسری حکومت کے بننے کا وقت ہے، درمیانی مدّت۔ خوب گھوڑے دوڑائے جا رہے ہوں گے، میں سوچتا ہوں۔

پھر Hay سے بریکن واپسی کا سفر۔ خاموشی میں ڈوبے کھیت، گھاس کے ہرے بھرے ٹیلوں میں اوّل وقت شام کا چاند ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے مگر پورا چاند۔

سارے راستے پورے چاند کا ساتھ ہے۔

اس کی اجلی، ٹھنڈی روشنی سڑک کے ساتھ بچھی گھاس پر پھیلی ہوئی ہے اور گاڑی کے شیشے میں جھلک رہی ہے۔ اسی روشنی میں، میں جلدی جلدی دن بھر کی روداد کو مکمل کر رہا ہوں۔

فیسٹی ول کے دوران یان لیانکے سے بھی ملاقات ہوئی۔

ہم کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ اپنے مترجمین کی ٹولی کے ساتھ آتا ہوا دکھائی دیا جو ہمہ وقت اس کے ہم راہ رہتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور چینی ادیب بھی تھا مگر وہ انگریزی

بول رہا تھا۔

یان لیانکے ہمارے پاس سے گزرا تو میں نے سلام کیا وہ جاتے جاتے رک گیا اور اپنی زبان میں خوشی کا اظہار کرنے لگا جو اس کے مترجمین نے ہم تک پہنچایا۔ اس کا سیشن بہت اچھا گیا، اس نے بتایا۔ اس کے ساتھ اس میں Ma Jain شریک تھا اس نے دوسرے ادیب کی طرف اشارہ کیا۔ یہ انگریزی نہیں جانتا تھا مگر ہم سے بولے جا رہا تھا، وہ انگریزی جانتا تھا مگر اس نے کچھ کہا ہی نہیں۔

میں نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔

اس لیے کہ میں اس کے کام سے واقف نہیں۔ پھر یوں ہی انٹ شنٹ کیا بات کرتا؟ باتیں کرنے کے لیے یان لیانکے کیا کم تھا؟

اگلی صبح وہ خیمہ گم ہوگیا۔ میں لیڈیا ڈیوس کے سیشن میں دیر سے پہنچا۔ ڈھونڈنے میں دیر ہوگئی، ہم پہنچے تو سیشن شروع ہو چکا تھا۔

بڑا ٹھاٹ دار ناشتہ کر کے ہم نے بریکن کو الوداع کہہ دیا تھا۔ سامان ساتھ لے لیا اور لے جا کر گرین روم کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ پھر اس خیمے کی تلاش شروع ہوئی۔

یہ ایک اور خیمہ تھا۔ اسٹیڈیم کی سیڑھیوں کی طرح مرحلہ وار اوپر ہوتی ہوئی نشستیں۔ ہم اندر آئے اور پیچھے چلتے چلے گئے، پیچھے اور اوپر۔

وہ دوسرے امریکی ادیبوں کا ذکر کر رہی تھیں اور اپنے والدین کے بارے میں بتا رہی تھیں کہ اس کی ادبی تشکیل و تربیت پر کس طرح اثر انداز ہوئے۔

ان کی والدہ نے بھی چند کہانیاں لکھیں اور ''نیویارکر'' میں شائع بھی ہوئیں۔ وہ کئی ادیبوں کو جانتی بھی تھیں۔ وہ اپنے گھرانے کے بارے میں کہتی ہیں،

it was a family where language was noticed. Nothing went by.

زبان کی باریکیاں، غلطیاں، چھوٹے چھوٹے نکتے اس خاندان کے لیے اہم تھے۔

پڑھنے کا بہت شوق تھا۔

I was reading for immersion in another world.

سوال جواب کے ساتھ ساتھ وہ بیچ بیچ میں کہانیاں بھی پڑھتی جا رہی تھیں۔ انہوں نے آٹھ صفحوں کی ایک کہانی پڑھی، یہ کہہ کر۔

I consider it too long, even though others wouldn't

بتایا گیا کہ اسی کہانی کو جیمز سالٹر نے ''گارجین'' کے پوڈ کاسٹ پر بھی پڑھا ہے۔

اخراجات کا تخمینہ کس طرح جذبات کا کھاتا کھول سکتا ہے، اس کہانی کے اختصار میں ایجاز ہے۔

یہ انٹرویو بھی فیوماٹا نے کیا تھا۔ ان کے بعض سوال دل چسپ تھے۔ مثلاً یہ کہ آپ بہت پُر مذاق نہیں معلوم ہوتیں مگر آپ کی بعض کہانیوں میں مزاح کی رو چل رہی ہے۔

سوال جواب کا سلسلہ چل پڑتا ہے تو میں بھی سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔

فیوماٹا مجھے غور سے دیکھ رہی ہے۔ کہیں اسے یہ اندیشہ تو نہیں کہ میں انعام کے بارے میں کوئی تلخ تاثر ظاہر کروں گا، مجھے خیال آتا ہے۔

مگر میں تو لیڈیا ڈیوس سے اس کے اکلوتے ناول کے بارے میں سوال کرنا چاہتا تھا جس کا میں نے اس پورے عرصے میں کوئی ذکر نہیں سُنا۔

وہ میرے اس سوال پر خوش ہو جاتی ہیں۔

''میں نے یہ کتاب لکھی اور یہ اچھی خاصی تھی!'' وہ اپنے مخصوص، بظاہر خشک لہجے میں کہتی ہیں۔ ناول میرے لیے بہت اہم تھا۔

I had a Mass of Material which was too much to go into a story.

مگر وہ یہ مانتی ہیں کہ ناول لکھنا ان کے لیے مشکل تھا۔ کام کرنے کے اس جذبے، اس عشق کو روز روز باقی رکھنا مشکل تھا۔

وہ اپنے لکھنے کے عمل کے بارے میں بات کرتی ہیں۔

The story formulates itself as I into. Then there is very

close revision. The language, the vocabulary chooses itself.

اپنا لکھنا اور ترجمہ کرنا، وہ اس میں توازن کیسے قائم کرتی ہیں۔

It is difficult to come back to translating after your own writing.

Coming back to my translations, I leave much of myself behind — like an actor doing impersonation.

سیشن کے خاتمے پر تالیوں کی گونج بہت زور دار ہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ لیڈیا نے وہاں موجود لوگوں پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔

اس کے بعد وہ کتابوں پر دستخط کرنے کے لیے دکان کی طرف چل دیتی ہیں۔ مجھ سے کل رات پاکستان کے ایک دوست نے فرمائش کی ہے کہ اس کی کتاب ضرور لے آؤ۔ انتظار صاحب بھی یہ کتاب خریدنا چاہتے ہیں۔

مگر کتاب کے خریدنے والوں کی لائن بہت لمبی ہے۔ ذرا دیر میں اعلان ہوتا ہے کہ کتاب ختم ہوگئی ہے۔ سب نسخے بک گئے۔

ہم ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔

دھوپ ایسی چمک دار نکل آئی تھی اور سارے منظر کو سنہرے سرخ رنگوں میں ڈبوئے دے رہی تھی کہ مجھ سے خیمے میں بیٹھا نہ گیا۔ انتظار صاحب بھی گرین روم سے باہر نکل آئے اور گھاس پر بچھی آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہوگئے۔ میں فیسٹی ول کی خیمہ بستی سے باہر نکل کر اس چھوٹے سے قصبے کی پرانی گلیوں میں گھومتا رہا جہاں چھٹی مناتے ہوئے گھومنے پھرنے آئے ہوئے لوگ زیادہ ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد شٹل بس چلتی ہے اور لوگوں کو خیمہ بستی واپس پہنچا دیتی ہے۔

مگر میرے لیے یہ تھوڑی مہلت بھی بہت ہے۔ مجھے وہ دکان بھی مل جاتی ہے جو اس قصبے کے ''بادشاہ سلامت'' کی دکان ہے اور ایک کتاب بھی جس کی مجھے تلاش ہے۔

میں واپس آتا ہوں تو گرین روم کے ریسپشن پر لیڈی یادیوں کھڑی ہوئی ہیں۔ انھوں نے دھوپ کی عینک لگا رکھی ہے۔

وہ صبح کے سیشن پر بات کرتی ہیں اور ایک بار پھر میرے اس سوال کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔

میں بتاتا ہوں کہ میں اس وقت کہاں سے آ رہا ہوں اور مجھے وہاں کیا ملا۔

میں اب واپس جارہی ہوں۔ وہاں قصبے میں کتابوں کی دکان کون سی اچھی ہے؟ مجھے جارج گرینگ کے ناول کی تلاش ہے۔

جس دکان کو میں دیکھ کر آیا ہوں اس کا تصویری پوسٹ کارڈ والا اشتہار ان کے حوالے کردیتا ہوں۔ پھر مادام بواری کا ان کا نیا ترجمہ کھول کر رکھ دیتا ہوں جو میں نے اس دکان سے خریدا تھا۔

میں نے تمہارا نام پھر غلط لکھ دیا ہے؟ تم وہ ای میل والا نام کیوں نہیں بتاتے؟

میں لکھتا اسی نام سے ہوں، میں بتاتا ہوں۔

جاتے جاتے وہ ہاتھ اٹھا کر سلام کرتی ہیں۔ تمہارے ملک کا سلام اسی طرح ہے؟ وہ ماتھے تک ہاتھ اٹھاتی ہیں پھر نیچے لاتی ہیں۔

اور اس طرح نہیں، وہ دونوں ہاتھ جوڑ لیتی ہیں۔

سلام، میں ان سے کہتا ہوں۔

وہ مڑتی ہیں اور تیز تیز قدموں کے ساتھ باہر چلی جاتی ہیں۔

گرین روم واپس آ کر میں اخبار میں فیسٹول کی خبریں پڑھ رہا تھا تو پہلا صفحہ کھل کر گر پڑا۔ پاکستان کا نام سُرخی میں دیکھ کر میں چونکا۔ پاکستانی طیارے میں دو مسافروں نے بم کی دھمکی دی، جہاز کو کسی اور شہر پر اُترنا پڑا۔

اندر کے صفحے پر بھی پاکستان کا نام ہے۔ جس فوجی کو قتل کیا گیا، اس کے قاتل کے ممکنہ رابطوں میں یہ نام بھی شامل ہے۔

پاکستان بطور ایک خطرہ، کیا ہم بس اسی طرح کی خبروں کا موضوع بن کر رہ گئے ہیں؟

اس دُبدھا میں Hay سے رخصت۔ اس سے آگے ہیرفورڈ کا سفر۔ وہاں سے ریل گاڑی۔ خوب صورت کھیت۔ چھوٹے بڑے مکان۔ ایک سکوت میں لپٹی ہوئی ہر شے۔ میرے برابر بیٹھا ہوا نوجوان مجھ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ وہ کاشت کار ہے اور شراپ شائر کا رہنے والا۔ برطانیہ کی زراعت کے بارے میں اور شراپ شائر کی گائے کے بارے میں میری معلومات صفر پاکر مجھے جلدی جلدی سبق پڑھانے لگتا ہے۔ پہلے میرے بارے میں اور پھر انتظار صاحب کی طرف اشارہ کرکے ان کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ میں بتاتا ہوں کہ وہ کون ہیں اور کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔ یہ کیا لکھتے ہیں۔ انتظار صاحب جواب نہیں دیتے لیکن اپنے بیگ میں سے ''بستی'' کا ایڈیشن نکال کر مجھ سے کہتے ہیں، اسے دکھا دو۔

کیا یہ اپنی کتاب مجھے بیچ دیں گے؟ وہ پوچھتا ہے۔

میں منع کردیتا ہوں تو وہ نوٹ بک نکال کر کہتا ہے، ایک صفحے پر ان کا نام لکھ دو، میں اپنے انکل کو بتاؤں گا جن کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ اور وہ ہندوستان بھی جاچکے ہیں۔

لیجیے، یہ آپ کا گرویدہ ہوگیا، میں انتظار صاحب سے کہتا ہوں۔ آپ سفرنامہ لکھیں تو اس کا نام بدل کر اسے ایک نوجوان لڑکی بنادینا چاہیے۔

بلا کا باتونی نوجوان شکر ہے کہ اگلے اسٹیشن پر اُتر گیا۔

دوڑتی بھاگتی ریل گاڑی ہمیں اس سفر کے آخری مرحلے پر لے آئی مانچسٹر۔

اسٹیشن پر انتظار صاحب کے بھانجے اور ان کی بیگم ہمیں لینے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ہم ان کی گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ انتظار صاحب ان کے گھر ٹھہریں گے، میں ناصر کاظمی صاحب کے ہاں ٹھہر رہا ہوں۔ باصر صاحب سے میری یہ پہلی تفصیلی ملاقات ہے، لیکن۔

عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کرگیا وہ۔ ان کے گھر میں، بات چیت میں ان کے مرحوم والد کا اتنا ذکر ہوتا ہے اور وہ ساری فضا میں اس طرح رچے بسے ہوئے ہیں کہ مجھے یوں لگا اتنے دن میں نے ناصر کاظمی کے ساتھ گزارے ہیں۔

یارک شائر ادبی فورم کی دعوت پر ہم لیڈز گئے جہاں انتظار صاحب کے ساتھ ایک شام

منائی گئی۔

مانچسٹر سے لیڈز تک کا خوب صورت راستہ، یارک شائر میں پھیلی ہوئی دھوپ اور نکھرا ہوا سبزہ۔

شہر میں داخل ہوئے تو پارکنگ ڈھونڈتے ڈھونڈتے راستہ بھٹک گئے۔ اس بہانے شہر کے مرکز کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔

تقریب تھوڑی دیر سے شروع ہوئی اور پھر وقت پر ختم کرنے کی جلدی بھی تھی کیونکہ لائبریری کی عمارت کو پانچ بجے خالی کرنا تھا۔

تقریب کے لیے پوسٹر بھی دلکش بنایا گیا تھا، بکر پرائز کی ویب سائٹ والی تصویر کی مدد سے۔ اب یہ حوالہ انتظار صاحب کے ویب رسورسز میں شامل ہوگیا ہے۔

عمارت کشادہ تھی، لوگ بھی خوب آئے ہوئے تھے۔ آس پاس کے علاقوں سے بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔

پہلی تقریر جن صاحب کو کرنا تھی وہ لمبا کھینچ گئے۔ دو مرتبہ تالیاں بھی بجیں اور سامنے کی قطار سے ایک خاتون نے برملا پکار کر کہا، ہم آپ کو سننے نہیں آئے۔ ان صاحب نے بھی کہہ کر مختصر کیا اور مختصر کرتے کرتے وقت لگا دیا۔

میں نے اپنا مضمون روک لیا۔ صفحہ بھر پڑھا، پھر کہا جب انتظار صاحب موجود ہوں تو ان کے بارے میں ایسے مضامین کی ضرورت کیا ہے۔

صدر محفل نے اس کے بعد انتظار صاحب سے کہا کہ اپنے بارے میں دو چار جملے انگریزی میں بھی بتائیے کیونکہ لائبریری کے منتظمین بھی موجود ہیں جو مقامی ہیں۔

انتظار صاحب نہ مانے۔ پھر مجھ سے کہا گیا۔ یہ کام میں نے بساط بھر سر انجام دیا۔ مگر ایک آدھ چٹکی لینے سے باز نہیں آیا، ان اردو والوں کے لیے جو انتظار صاحب کا نام اب لینا شروع کررہے ہیں، بکر انعام کی نامزدگی کے بعد۔

صدر محفل نے میرا شکریہ ادا کیا کہ انگریزی میں یہ گفتگو وہاں موجود نوجوانوں کے لیے

خاص طور پر مفید تھی۔

انتظار صاحب نے غیر رسمی گفتگو کی، اس کے نوٹس۔

میرے لیے بات کرنا آسان نہیں ہے۔ میں جب افسانہ لکھ رہا ہوتا ہوں تو اس وقت تک میرے آس پاس روشنی ہوتی ہے۔ جب افسانہ ختم ہو جاتا ہے تو میں اندھیرے میں ہوتا ہوں۔

اس وقت بھی میں اندھیرے میں ہوں۔

تقسیم کا جھٹ پٹا تھا جب میں نے افسانہ نگار کی حیثیت سے آنکھ کھولی۔ تقسیم کا ہنگامہ اور فسادات کی فضا...... تقسیم کے بعد میں نے دیکھا کہ ہمارے اردگرد جو لوگ تھے وہ غائب ہونا شروع ہو گئے۔ ہر طرف سراسیمگی سی تھی۔ میری پاکستان آمد...... جیسے طوفان کے ساتھ پتے اڑتے چلے آ رہے ہیں۔ میں بھی ایسا ایک پتہ تھا۔

لاہور آنے کے بعد ایسا لگا ہم نئی زمین پر چل رہے ہیں۔

مظفر علی سیّد نے میری کہانی سنی۔ اس نے کہا، اس میں تو سرشار کا رنگ ہے۔ پھر ناصر کاظمی سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔

عسکری صاحب کا مسئلہ یہ تھا کہ نیا دور شروع ہو چکا ہے، اس تجربے کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔ جو افسانے لکھے جا رہے ہیں، شاعری ہو رہی ہے، اس میں یہ سارا تجربہ اپنا تخلیقی اظہار بھی تو پائے۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ انہیں جلدی تھی کہ اب ایسا ادب پیدا ہو بھی چلے......

مال روڈ کے نکڑ پر پنواڑی کی دکان تھی۔ رات کو ٹہلتے پھرنے کے بعد ناصر کاظمی اس سے آگے نہیں جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے مجھے یہاں ڈر لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے مولانا حالی مفلر گلے میں ڈالے کھڑے ہیں اور شعر پڑھ رہے ہیں، تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور......

وہ پان والا ماچس کی ڈبیوں سے عمارت بناتا تھا۔ پھر اس کو گرا دیتا تھا، ڈھے گئی بستی......

گفتگو کے بعد سوال پوچھنے والے پہلے ہی حضرت ۶۴، ۶۵ء سے شروع کرتے ہیں

جب لاہور کے پاس کسی قصبے میں انہوں نے انتظار صاحب کو دیکھا تھا۔ پھر پوری رام کہانی کے بعد پوچھتے ہیں، ناسٹلجیا vice ہے یا virtue۔

انتظار صاحب بڑے صبر سے سوال سن رہے ہیں۔ پھر ٹکڑا سا توڑ کر ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ ناسٹلجیا خوبی ہے یا خرابی، میں نہیں کہہ سکتا، یہ میرے افسانے بتائیں گے۔ آپ کے سوال کا جواب میرے افسانوں کے پاس ہے، میرے پاس نہیں۔

اب اس کے بعد کیا سوال جواب مزید ہونے تھے۔ تصویریں کھینچیں، سموسے کھائے گئے، چائے پی گئی اور سب ہنسی خوشی اپنے گھروں کو رخصت۔

سوائے میرے۔ مجھے کسی اور کے گھر جانا تھا۔

میں نے سُن لیا تھا کہ یہاں سے واپسی کا راستہ برانٹے سسٹرز کے آبائی مکان کے قریب سے ہوکر گزرتا ہے، میں نے انتظار صاحب سے کہا۔ برانٹے سسٹرز کے نام پر وہ بھی تیار ہوگئے۔

فنکشن ختم ہونے کے لوازمات میں نے جیسے تیسے بھگتائے۔ پھر ہاورتھ پارسینج۔ آبائی مکان۔ قبرستان۔ وہ اسکول جہاں کچھ دن شارلٹ نے پڑھایا۔ اونچا نیچا راستہ۔ چھوٹا سا قصبہ۔ عناصر میں جس تلاطم کا نام ایملی برانٹے تھا، وہ یہیں سے گزری ہوگی۔

میں کچھ دیر یہاں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ اس فضا میں سانس لینا چاہتا ہوں، اس خاک و باد کو سینے میں جذب کرلینا چاہتا ہوں۔ مگر اندھیرا بڑھ رہا ہے، اب رات ہونے والی ہے۔

برانٹے سسٹرز نے یاد دلایا اور انتظار صاحب کو یاد آیا پچھلی بار وہ اس علاقے میں آئے تھے تو لیک ڈسٹرکٹ بھی گئے تھے اور وہاں ورڈز ورتھ کا مکان دیکھا تھا۔ ان کو یہ جگہ دوبارہ دیکھنی ہے، وہ میزبانوں سے کہتے ہیں۔ ارے بھئی، وہاں بھی تو جانا ہے ورڈز ورتھ کے ہاں...... وہ اس طرح کہہ رہے ہیں۔

ہم وہاں چلے تو گئے لیکن ہمارے ساتھ بارش اور سردی بھی چلی۔ ذرا قدم نکالو اور بوچھار...... ہلکی، تیز بارش میں ڈوبے ہوئے مناظر جن میں فطرت کی فراوانی بھلی معلوم ہو رہی

ہے۔ راستے میں کئی جگہ ڈیفوڈلز جھومتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

ورڈز ورتھ کا مکان باقاعدہ قسم کا میوزیم بنا ہوا ہے۔ میں اس امر پر حیران ہوتا ہوں کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی کتنے جتن سے محفوظ رکھی گئی ہے، اس کے برخلاف ہمارے ہاں چیزوں کی بربادی کا ایک سیلِ بے کراں ہے۔ بارش میں بھیگتے ہوئے ہم میوزیم میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہمارے اردگرد باقی سب لوگ جاپانی ہیں...... معلوم ہوا کہ یہ گائڈ ٹور جاپانی زبان میں ہے ـــــ ارے معاذ اللہ! میں تو الٹے پیروں بھاگ آیا۔ میوزیم کی دکان میں پناہ لی ـــــ چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ایک اور انبار جو اس قسم کی کسی بھی یادگار کا لازمی حصّہ بن گیا ہے۔ میں میگنٹ خریدتا ہوں اور اے ایس بائیٹ کی کتاب جو ورڈز ورتھ اور کولرج کی دوستی کے بارے میں ہے۔ اور کپڑے کا تھیلا جس پر ورڈز ورتھ کی ڈیفوڈلز والی نظم کی ابتدائی سطور چھپی ہوئی ہیں۔

جاپانی زبان کا دور دورہ وہاں ختم ہوتا ہے تو ہم ادھر جاتے ہیں، میں پھر حیران ہوتا ہوں کہ گھر کے چھوٹے چھوٹے معمولات کو بھی محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، ورڈز ورتھ کے بارے میں ہمہ وقت جاری نمائش میں اس کی شاعری سے گہری واقفیت حاصل کرنے کے لیے کیسی اُکساہٹ بھری ہوئی ہے۔ افیم کے دل دادہ تھامس ڈی کوئنسی کے کئی آثار بھی نظر آئے، مجھے خبر نہیں تھی کہ ورڈز ورتھ کے بعد یہ مکان اس کے تصرّف میں رہا تھا۔

انتظار صاحب بڑی توجہ سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ بہت دیر کے بعد خیال آیا کہ ہم تو چائے پینے کا ارادہ کر رہے تھے...... اور اس مقصد کے لیے وہاں ایک سے ایک دل نشیں جگہ موجود......

ایک صبح مانچسٹر یونیورسٹی کی سیر اور زبانوں کے تدریسی مرکز کا دورہ۔ وہاں اردو کے استاد شیراز علی صاحب سے ملاقات اور اس کے بعد مانچسٹر میوزیم۔

پھر اگلے دن واپسی۔

ایک تھیلا جو میں کندھے پر اٹھائے اٹھائے ہر جگہ پھر رہا ہوں، اس میں کاپی، قلم (بلکہ کئی عدد بال پین کا گچھا، اس ڈر سے کہ نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے!)، ڈھلا ہوا رومال، دوائیں، پڑھنے والی عینک اور بہت سا الّم غلّم پڑا ہوا ہے ــــ بعض چیزیں جو صرف اس لیے ہیں کہ پچھلے کسی نہ کسی سفر کے بعد انہیں نکال کر رکھنے کا وقت نہیں ملا، اور بعض چیزیں ایسی کہ جن کو رکھنے کے لیے کوئی اور جگہ سمجھ میں نہ آئی ــــ ان میں ایک اضافہ بلکہ باوزن اضافہ آئی پیڈ ہے جو غزل کے اصرار پر میں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ صبح شام اس کا میرا ساتھ ہے، جب بھی وقت ملتا ہے بلکہ وقت کم ہو تب بھی۔ فیس بک پر میں بہت سے لوگوں سے رابطے میں ہوں۔ ان کی اپنی مصروفیات کی تفصیل اور میں جو کچھ ایکٹی وٹی کے طور پر درج کر رہا ہوں، اس پر ان کے رواں تبصرے میرے ساتھ ساتھ ہیں۔ سب سے زیادہ تعجب خیز دل چسپی کے ساتھ میں عبداللہ حسین کے اندراجات پڑھ ڈالتا ہوں جو بڑی باقاعدگی کے ساتھ کمنٹ کر رہے ہیں......

فیس بک کی ''دیوار'' پر کچھ نہ کچھ لکھتے ہوئے اپنے کمرے میں نیم دراز یا کسی میز پر آئی پیڈ کا کنکشن لگائے ہوئے شاید اس بات سے زیادہ فرق نہیں پڑتا کہ کمرے کے باہر کون سا شہر ہے۔ میں اپنے ساتھ ہوں اور میرے رابطے میرے ساتھ...... میں روزمرہ حالات پر دوستوں کے تاثرات اسی طرح سُن رہا ہوں، دیکھ رہا ہوں......

ایسی ہی ایک صبح میں نے فیس بک کی دیوار پر لکھا۔

لوڈ شیڈنگ، الیکشن اور اس کے بعد کے لاینحل مسائل اور تبدیلی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود سب کچھ وہی رہنے کے جاری و ساری عمل کے باوجود میں اب گھر جانا چاہتا ہوں۔

سو میں گھر کو یاد کرتا ہوں اور دل ہی دل میں گھر جانے کے عمل کو دہراتا ہوں۔ گاڑی بڑی سڑک سے مڑ کر اس گلی میں آ جاتی ہے جس پر گھر واقع ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سب بدل تو نہیں گیا۔ میں دروازے میں داخل ہو رہا ہوں گا، گھر، میرا کمرہ، میرا بستر، کتابوں کی الماری، لکھنے کی میز پر کاغذوں کا پلندہ...... کیا سب کچھ اسی طرح ملے گا؟ وہی بے ترتیبی،

بکھراؤ...... کچھ بنا دینے کی کوشش؟

پھر مجھے ایک بات یاد آ جاتی ہے تو ایک بہت ہی دل چسپ کتاب میں پڑھی تھی۔ روزمرہ زندگی کے معمول میں تیز، باریک بیں مشاہدے، غور و خوض اور فکر پر مبنی "فلسفیانہ مشق" پر مبنی فلسفے کے غالباً فرانسیسی استاد راجر پول دروئے کی چھوٹی سی کتاب جو ۱۰۱ ایسی مشقوں پر مبنی ہے۔ ان میں سے بعض بہت دل چسپ تھیں اور بعض مشکل نہیں تو ناممکن ــــــ اپنے ہاتھوں کے درمیان دیوار بنا ڈالو، ایک لفظ کو معنی سے تہی کر کے دیکھو، اپنے قدموں تلے ستارے بکھرے ہوئے دیکھو، اپنے کمرے میں ایک جھیل میں کشتی کے چپّو چلاؤ ــــــ اس میں یہ تجربہ بھی شامل کرلوں کہ ایک سو ایک کی فہرست میں سے جتنے یاد آ سکیں، ان کو یاد کرلوں۔ لیکن پہلے وہ مشق جس کے بارے میں پڑھ کر مجھے لگا تھا کہ یہ تو میں نہ جانے کب سے کرتا آیا ہوں ــــــ ایک سفر کے بعد اپنے کمرے کو دوبارہ دریافت کرو۔

تم بہت دور سے واپس آئے ہو۔ یا بہت دنوں کے بعد۔ نہیں، یہ اور کوئی نہیں ہے، یہ میں ہوں جو بہت دور سے آیا ہوں ایک سفر کے بعد۔ اور اپنے آپ کو اپنے معمول میں جوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ نہیں، ابھی تو میں صرف اس مشق کو دل ہی دل میں دہرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور یہ اندازہ لگا رہا ہوں کہ جب واپس جاؤں گا تو پھر ایسی ہی ایک کوشش کے دوران میں یہ کتاب اٹھا کر اس کی عبارت پڑھ رہا ہوں گا۔ اور وہ ساری تفصیلات پڑھ رہا ہوں گا جو مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہی ہیں، اتنی تفصیل اور تکمیل کے ساتھ یاد نہیں آ سکتی ہیں۔

تب میں پڑھ رہا ہوں گا ــــــ

تمہیں ضرورت ہے کہ دور دراز سے واپس آئے ہو۔ یا لمبے عرصے کے لیے دور رہے ہو۔ تم اپنے روزمرہ معمول کی عادت سے ہٹ گئے ہو۔ تم مختلف بستروں میں سوئے ہو، مختلف کھانوں کے عادی ہو گئے ہو۔ تم موسم، آہنگ اور افق میں تبدیلی سے گزرے ہو۔ تم نے مختلف زبانیں سُنی ہیں اور اپنے معمول سے مختلف سرگرمیوں میں مصروف رہے ہو۔ تمہارا جسم اور روح ان نئی عادتوں کے موافق اپنے آپ کو ڈھالتے رہے ہیں۔ اور اب تمہارے سامنے تمہارے گھر کا دروازہ آنے والا ہے۔

دروازہ کھول کر میں اندر چلا گیا ہوں گا۔ سامان ایک طرف رکھ کر اور گھر والوں سے ملنے کے بعد جب میں بستر پر لیٹ جاؤں گا اور ہر چیز کو توجہ کے ساتھ دیکھ رہا ہوں گا۔ مجھے اپنے کمرے کی آوازوں، فاصلوں اور رنگوں کا دوبارہ سے جائزہ لینا ہے۔ میں اس کتاب میں پڑھ رہا ہوں گا۔

You must first repossess the volume, reframe the distances and readjust the colours.

مگر ان میں سے کوئی ایک لفظ بھی اپنی جگہ مکمل نہیں ہے۔ سب ادھورے ہیں، ناکافی۔ میں اس کتاب میں لکھا ہوا دیکھ رہا ہوں گا۔ اس عمل کے لیے جو بہت تیز رفتاری اور بالکل نامحسوس طریقے سے ہوتا رہتا ہے، ہماری موجودہ لغت میں الفاظ میسر نہیں ہیں۔

اس تبدیلی اور مانوس پن کے دوران، ترتیب حاصل کرنے میں مجھے ہمیشہ مشکل پیش آتی ہے۔ کوئی ایک آدھ چیز بھی اپنی جگہ سے ہٹ کر رکھی ہوئی نظر آتی ہے تو اس پر جھنجھلاہٹ ہونے لگتی ہے۔ پھر اس اجنبی سے مانوس پن کو دوبارہ حاصل کرنے میں وقت لگتا ہے۔

لیکن سارے ٹکڑے اپنی ترتیب کے ساتھ دوبارہ جُڑ جاتے ہیں۔

تب تم اپنے سفر کے بارے میں صیغۂ ماضی میں بات کرنے لگو گے۔

اس کتاب میں یہ فقرہ بھی لکھا ہوا تھا اور یہ ایک فقرہ جیسے میرے ذہن میں جذب ہو کر رہ گیا۔

میں جب سفر کے دوران اس مشق کو یاد کر رہا ہوں تو اسی کو دُہرا رہا ہوں اور جب گھر جا کر یہ کتاب دیکھ رہا ہوں گا تو یہ فقرہ میرے سامنے ایک بار پھر ایک نئے در کی طرح باز ہو رہا ہو گا۔

صبح سویرے اسٹیشن جانے کے لیے ہم باصر کاظمی کی گاڑی میں بیٹھے۔ گاڑی نے گلی کا موڑ کاٹا تو انتظار صاحب نے زور سے پڑھا، رخصت اے اہل مانچسٹر ہم سفر کرتے ہیں۔

میں نے کہا، آپ نے یہ کیوں نہیں پڑھا، پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔

انہوں نے فوراً گرہ لگائی، اب تو جاتے ہیں بُت کدے سے میر۔

باصر کاظمی نے داد دی، آپ نے بت کدے کو مے کدہ بنا دیا، یہ بھی خوب کیا۔

یوں باتوں میں راستہ کٹ گیا۔ پتہ بھی نہیں چلا، کوچ کا اسٹیشن آ گیا۔

بادل تھے مگر بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔

کوچ اپنے اسٹیشن سے تھوڑا ہی دور نکلی ہوگی کہ بارش نے آلیا۔ ہم آگے کی طرف بیٹھے تھے، کوچ کے بڑے بڑے شیشوں پر بوندوں کی بوچھار...... جیسے سارا منظر بہا چلا جا رہا ہے۔

چلتے چلتے کوچ ایک جگہ رکی اور ڈرائیور اُتر گیا۔ اس کی جگہ دوسرے ڈرائیور نے لے لی۔

یہ کیوں رُکی ہے، کیا ہو رہا ہے؟ انتظار صاحب پوچھتے ہیں۔

ڈبا نہیں کٹا، ڈرائیور بدل رہا ہے، میں انہیں بتاتا ہوں۔ ایک ڈرائیور زیادہ دیر تک گاڑی نہیں چلاتا۔ یہ بھی کیسا اچھا نظام ہے۔

ڈرائیور تو ڈرائیور، ہمارے ہاں پائلٹ کو آرام نہیں کرنے دیتے۔ وہ یاد ہے حادثہ جو ہوا تھا، پائلٹ مستقل ڈیوٹی کرتا رہا تھا۔ انتظار صاحب کہتے ہیں۔

باتیں کرتے کرتے ہم کوسٹا کافی کے اسٹال پر جا بیٹھے ہیں۔ ہم سینڈوچ اور کافی سے لطف لے رہے ہیں، باہر سردی ہے اور بارش۔ بس کے چلنے میں ابھی دیر ہے۔

بارش اس وقت بھی نہیں تھمی تھی جب ہم لندن پہنچے اور دردانہ انصاری کی مصورہ بیٹی امینہ ہمیں لینے کے لیے پہنچی۔ تھوڑی دیر بعد دردانہ انصاری بھی آ جاتی ہیں اور ہم لدے پھندے ان کی گاڑی میں سوار ہو جاتے ہیں۔

شام کو راشد اشرف صاحب سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ انتظار صاحب سے پوچھنے لگتے ہیں، وہ لڑکا یاد ہے جو فلاں تصویر میں پاک ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر پر کھڑا ہوا ایک کاغذ پڑھ رہا تھا؟ وہ لڑکا میں تھا۔

پھر پوچھتے ہیں، وہ فلاں یاد ہے آپ کو؟

انتظار صاحب کہتے ہیں، ہاں۔

اس کا انتقال ہوگیا، راشد اشرف صاحب بتاتے ہیں۔

زیادہ پرانے دوستوں کی خیریت اس طرح نہیں پوچھنا چاہیے، انتظار صاحب کہتے ہیں۔

پتہ چلتا ہے اب وہ دنیا سے گزر گئے۔

ماحول تھوڑی دیر کے لیے اداس ہوجاتا ہے۔ مگر زیادہ دیر کے لیے نہیں کیوں کہ ہم کھانا کھانے کے لیے ساؤتھ آل جا رہے ہیں۔ راستہ بھی اچھا ہے اور پھر دردانہ انصاری نے گانے بھی لگا دیے ہیں۔ گاڑی میں آواز گونجتی ہے۔

تجھ سے ناراض نہیں زندگی

حیران ہوں میں......

پریشان ہوں میں......

اسی حیرت سے دوچار ہم سڑک پر گھوم رہے ہیں۔ پاکستانی ہندوستانی ہوٹلوں کی بھرمار اور ہر طرف مانوس چہرے۔ ہم جس ہوٹل میں کھانا کھانے جاتے ہیں وہاں کام کرنے والے جس نوجوان سے چاہو پوچھ کر دیکھ لو۔ کوئی فیصل آباد سے آیا ہے تو کوئی ملتان سے۔ میں سوچنے لگتا ہوں یہ اپنے ملک میں باعزّت روزگار کیوں نہیں حاصل کرسکتے؟ اس کے لیے ان کو اتنی دور کیوں آنا پڑتا ہے؟

کھانا عمدہ ہے، یعنی جس طرح کا لاہور میں مل سکتا ہے۔ ہم باتیں کر رہے ہیں اور گاڑی ایک کے بعد ایک قابلِ دید مقام کے سامنے سے گزر رہی ہے جس کی نشان دہی دردانہ انصاری کر رہی ہیں۔ ارے فلاں جگہ بھی رہ گئی اور فلاں بھی...... کتنی بہت سی جگہیں باقی ہیں۔ ایک آدمی کیا کیا دیکھ سکتا ہے۔ محدود مدّت میں۔ اس کے لیے لوٹ کر آنا ہوگا۔

ہیتھ رو کے قریب ہی شیرٹن ہوٹل ہے جہاں ہم رات گزاریں گے اور صبح سویرے شٹل آکر ہمیں ایئرپورٹ لے جائے گی۔ شٹل کے ڈرائیور کا فون نمبر اور گاڑی کا نمبر ایس ایم ایس کے ذریعے ہم تک پہنچ جاتا ہے۔

اب سامان بھی بندھ چکا۔

اس کے بعد کے مرحلے بھی خوبی سے طے ہو گئے۔ جہاز اپنے مقررہ وقت پر اڑا۔ جہاز میں سیٹیں برابر برابر ہیں۔ انتظار صاحب ندیم اسلم کا نیا ناول پڑھ رہے ہیں جو مصنّف نے ان کو لندن میں پیش کیا تھا۔ وہ بہت انہماک سے پڑھ رہے ہیں۔ اور کھانے کے لیے جو چیزیں لائی جا رہی ہیں، ان کو یوں ہی واپس بھجوا رہے ہیں۔ میرے ہاتھ میں یان لیانکے کا ناول ہے، جو میں پڑھتا ہوں پھر تکلیف کے ساتھ کچھ دیر کے لیے الگ رکھ دیتا ہوں۔ پھر چھوڑا بھی نہیں جاتا، دوبارہ اٹھا لیتا ہوں۔

بہت تکلیف دہ ناول ہے، میں انتظار صاحب سے کہتا ہوں جب وہ میرے ہاتھ سے لے کر یہ ناول دیکھنے لگتے ہیں۔ اس میں شدّت اتنی ہے کہ رہ رہ کر چھوڑنا پڑتا ہے۔

اس ناول کا بھی یہی حال ہے، وہ بتاتے ہیں۔ طالبان کے ظلم کا بیان بہت تکلیف دہ ہے۔ مگر کہانی میں سسپنس بہت ہے۔

پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ کہتے ہیں، یہ کیسے ناول ہیں اور کیسی دنیا کا بیان کر رہے ہیں۔ اس دنیا کو کیا ہو گیا؟

میں بھی سوچنے لگتا ہوں، واقعی۔ یہ کیسی دنیا ہے اور اس میں کیسے کیسے ناول لکھے جا رہے ہیں۔

جہاز ابھی منزل سے بہت دور ہے۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ دُنیا پھر کیسی ہو جائے گی۔

مئی۔ جون ۲۰۱۳ء

تحریر در تحریر

انتظار صاحب لاہور پہنچ گئے۔

ابوظہبی کے لاؤنج تک ہمارا ساتھ رہا۔ وہاں سے ان کو لاہور جانا تھا اور مجھے اپنے شہر۔
انتظار صاحب نے روزنامہ ایکسپریس میں اپنے کالم میں سفر کا کچھ احوال لکھا ہے۔ میں
اسے پڑھتا ہوں، پھر اخبار سے تراشہ کاٹ کر رکھ لیتا ہوں۔

پسِ تحریر

جتنے دن ہم سفر میں رہے، بکر انعام کا کچھ نہ کچھ چرچا احبابِ وطن میں بھی رہا اور تھوڑا بہت ذکر ہمارے واپس آنے کے بعد ہو رہا ہے۔ انعام کے بارے میں مسعود اشعر کا کالم ہماری غیر موجودگی میں چھپا تھا۔ وہ اس کا تراشہ بھیج دیتے ہیں تو میں وہ کالم بھی دیکھ لیتا ہوں۔

O

انتظار صاحب نے ڈان کے انگریزی کالم میں بھی اپنے سفر کا احوال لکھ دیا۔ اس کا تراشہ میں جوسپ نوا کووچ، ماری این ڈیائے، آننتھ مورتی اور لیڈیا ڈیوس کو بھیج دیتا ہوں۔

سب سے پہلے لیڈیا ڈیوس کا تفصیلی جواب آتا ہے۔

یہ کالم بھیجنے کے لیے تمہارا شکریہ۔ مجھے یہ معلوم کرنے میں بہت دل چسپی تھی کہ انتظار حسین نے لندن کے جشن اور پھر Hay کے سفر کے اس سارے تجربے کے بارے میں کس طرح سوچا، میں انتظار صاحب کو وہ میسیج ٹیلی فون پر پڑھ کر سنا رہا ہوں ـــــ میں نے ان سے بات کرنے کی تھوڑی کوشش بھی کی لیکن مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ میری بات کو کس حد تک سمجھ سکے۔ میں اس بات سے بہت متاثر ہوئی کہ تم اور وہ Hay میں میرے پروگرام میں شریک ہوئے اور یہ کہ تم نے سوال بھی پوچھا۔ یہ تمہاری مہربانی تھی۔ میری اصل پریشانی یہ تھی ـــــ کیا حسین صاحب کے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ اتنا لمبا سفر طے کر کے آئیں اور پھر مایوس ہو کر لوٹ

جائیں؟ میں نے مگر بعد میں اس پروگرام کے منتظمین سے اس موضوع پر بہت بات کی اور یہ تجویز
بھی پیش کی غالباً یہ بہتر ہوگا کہ کوئی ایک شخص اس انعام کا حق دار نہ ٹھہرایا جائے بلکہ دس خوش
قسمت (بلکہ مستحق) آخری مرحلے کے نام زدگان ہوں! لیکن انہوں نے کہا کہ پھر وہ ان لوگوں کو
لندن کے سفر کے لیے مائل کیسے کرسکیں گے؟ میں اس سوال سے ابھی تک نبرد آزما ہوں۔

اچھا، اب میرے پاس حسین صاحب کا ناول بستی موجود ہے۔ کیا تمہیں ان کی یہی
کتاب سب سے زیادہ پسند ہے یا پھر تم ان کے افسانوں کو پسند کرتے ہو ـــــ یا پھر تمہیں سبھی
پسند ہے؟ میں یہ تو نہیں پوچھوں گی کہ خود انہیں کیا پسند ہے اس لیے کہ بسا اوقات ایسے سوال
کے لیے مصنف خود بہترین جواب دینے والا نہیں ہوتا۔

بہرحال، تم دونوں سے ملنا بہت اچھا تھا اور میں اب کتاب پڑھنے کا ارادہ کر رہی ہوں
اس لیے کہ معاملات اب ذرا پُرسکون ہو رہے ہیں۔

میں پڑھتے پڑھتے رُک جاتا ہوں تو انتظار صاحب اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں، بہت
اچھا خط ہے بھئی۔

مگر ان کا اپنا تاثر کیا ہے، یہ سوال براہ راست اور پوری تفصیل سے پوچھنے کا موقع مل جاتا
ہے جب ہندوستان کا ایک اخبار مجھ سے کہتا ہے کہ ذرا انتظار صاحب سے یہ سوال تو پوچھ دو۔

کاغذ قلم سنبھال کر میں پھر ٹیلی فون ملاتا ہوں۔ اور ان کی باتیں پھر نوٹ کرتا جاتا ہوں۔

سوال یہ تھا کہ اس تقریب میں شرکت اور لندن کے سفر کا یہ تجربہ کیسا رہا۔ وہ کہتے ہیں،
تجربہ تو یوں ہے کہ لندن تو وہ شہر ہے کہ...... میں کیسے اس کا اظہار کروں...... یعنی بہت اچھا رہا۔
لندن کے رعب اور اثر میں تو ہماری برصغیر کی کتنی ادبی نسلیں پروان چڑھی ہیں۔ ہمارا تو قبلہ و کعبہ
رہا ہے لندن۔ اب میں اس شہر میں ہوں اور اپنی اردو کے حوالے سے آیا ہوا ہوں...... تو یہ شہر
ہمارے لیے خواب تھا۔ اب میں وہاں اس جشن میں شریک ہوں اور بہت اچھا لگ رہا ہے۔

اور وہ تقریب بھی بہت اچھی تھی، وہ الگ سے وضاحت کرتے ہیں۔

اگلا سوال یہ تھا کہ اس انعام کے لیے آپ کی نام زدگی پر پاکستان میں لوگوں کا کیا

ردعمل تھا۔

اس کا جواب وہ بالکل سیدھا نہیں دیتے، بات کو ذرا پھیلا کر بیان کرتے ہیں۔ بات یہ ہے، انہوں نے کہا کہ مُلّا کی دوڑ مسجد تک۔ ایک تو اپنا دائرہ تھا اور اس سے آگے نکل گئے تو ہندوستان تک پہنچ گئے تو ہم اسی پر خوش ہوتے تھے۔ اب اس دائرے سے بھی نکل کر مغرب میں پہنچ گئے۔ تو بہت عجیب لگا۔

اس حوالے سے اس انداز میں کوئی فرق پڑا جس طرح لوگ آپ کو دیکھتے آئے ہیں، میں اخبار والوں کے سوال کو واضح کرنے کی کوشش میں شاید اور بھی اُلجھا دیتا ہوں۔

فرق تو پڑنا چاہیے تھا، وہ کہتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے ادیب کے ساتھ یہ معاملہ ہے کہ جب سند باہر سے آجائے، خاص طور پر لندن سے تو ادیب کا قد بڑھ جاتا ہے تو مجھے بھی بعضوں نے داد دی، بعضوں نے طنز کیا کہ تم تو لندن پلٹ ادیب ہو۔ اب وہ طنز کریں یا کچھ، ادیب کا قد خود بخود اونچا ہوجاتا ہے۔ ہمارا ادب تو وہیں رہتا ہے، لکھنے والے کا قد بڑھ جاتا ہے۔ ادب اپنی جگہ جیسا تھا ویسا ہی رہا۔

ہندوستان میں آپ اپنی تحریروں کا تعارف کیسے کرائیں گے، اخبار کا اگلا سوال تھا۔ مگر اس کا جواب بہت واضح تھا۔ میں یہ کرچکا، انہوں نے کہا۔ ان سے جو داد لینی تھی، لے چکا۔

پسندیدہ ادیب کا نام بتانے کی بھی فرمائش تھی۔ سو انہوں نے کہا کہ وہ ایسا کئی بار کرچکے ہیں۔ پھر کچھ سوچ کر بولے، اچھا چلیے بدل کر بات کرتا ہوں۔ اب ہم اس قسم کے اسکالر تو ہیں نہیں کہ تجزیہ کرتے رہیں۔ ہم تو کہانیاں لکھتے رہے اور ادھر ادھر بھٹکتے رہے: اور اگر کسی ادیب سے مڈھ بھیڑ ہوگئی تو جیسے اندھے کے پاؤں کے نیچے بٹیر آجائے۔ ایسے ہی جاتک کہانیوں سے مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ تو وقت بدل جاتا ہے اور ہمارے پسندیدہ ادیب بھی بدلتے جاتے ہیں۔ پہلے ہمارے پسندیدہ نام چیخوف اور جوائس کے تھے اور فی الحال مہاتما بدھ ہمارے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔

پھر آخر میں پوچھنا یہ تھا کہ خود انہیں اپنی کون سی کتاب سب سے زیادہ پسند ہے۔

یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے، انتظار صاحب نے کہا۔ جو نئی کتاب آتی ہے ہمیں لگتا ہے کہ پچھلی کتابوں سے بہتر ہے۔ نقادوں اور قاری کا فیصلہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ جیسے وہ کسی پچھلی

کہانی کا بار بار حوالہ دے رہے ہیں اور ہمیں یہ لگتا ہے کہ یہ کہانیاں بہتر ہیں۔ بستی کے بعد جو ناول لکھے تو ہمیں یہ لگا کہ شاید ان میں بہتر کارکردگی دکھائی ہے۔ مگر پڑھنے والے بار بار اسی کا حوالہ دے رہے ہیں۔

انتظار صاحب اتنا کہہ کر معاملہ پڑھنے والوں کے اوپر چھوڑ دیتے ہیں۔

اب بات انتظار صاحب کے پورے کام پر آ گئی اور جس کے لیے بُکر انعام بس ایک حوالہ ہے، پورا قصہ نہیں۔ یہاں سے پھر ایک نیا موڑ۔ اس سے آگے کیا ہے، مجھے نہیں معلوم۔

جہاں معلوم کی سرحدیں ختم ہو جائیں، سفر وہاں سے شروع ہوتا ہے......

یوں بقول شخصے میری شہرت و ''عظمت'' کا جو پانچ منٹ کا کُل عرصہ تھا، وہ پورا ہو گیا میں اپنی جگہ سکون سے جا کر بیٹھ سکتا ہوں۔ مہلت پوری ہوئی اور میں اپنی زندگی کے معمول کے تار و پود میں پلٹ جانے کے لیے تیار......

یہ سفر تمام ہوا۔ زندگی جاری ہے۔

آصف فرخی کے زیرِ نظر سفرناموں کو پڑھتے وقت بار بار ہم ایک بھید بھری کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں اور ان کے ادراک کی گرفت پر بار بار ہماری حیرت جاگتی ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ آصف نے اس روداد کو صرف اپنی یا انتظار حسین کی روداد کے بیان تک محدود نہیں رکھا ہے۔ ایک وسیع تر تناظر اور متعدد کرداروں کی شمولیت نے اس پورے قصے کو ایک ہمہ گیر فکری اور تخلیقی تجربے میں منتقل کر دیا ہے۔ یوں بھی اس قصے کے مرکز میں ایک بین الاقوامی اور عالمی حیثیت رکھنے والے ادبی واقعے کی موجودگی نے، اسے ایک رنگارنگ اور ایک ساتھ کئی جہتیں رکھنے والی ذہنی اور تخلیقی سرگرمی کے بیان کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ مین بکر بین الاقوامی انعام ۲۰۱۳ء کے پس منظر میں ایک ساتھ موجودہ ادبی دنیا کے کئی ممتاز لکھنے والوں کی شبیہیں، اس قصے کو ایک اسرار آمیز ڈرامے کے طور پر بھی سامنے لاتی ہیں۔ اس طرح یہ سفر اس عہد کے فکشن سے مربوط ایک غیر معمولی حیثیت رکھنے والے واقعے کا بیان بھی ہے، جا بجا ڈرامائی عناصر اور ایک جانی انجانی صورتِ حال کی عکاسی پر مشتمل۔ کمال کی بات یہ ہے کہ آصف نے اس قصے کو [illegible] سچائی یا ایک جیتے جاگتے واقعے کی سطح سے اٹھا کر، اسے ایک تخلیقی واردات اور حیرت و استعجاب [illegible] بولتی ہوئی کہانی بنا دیا ہے۔

شمیم حنفی

Rs. 400.00

www.sangemeel.com

ISBN-10: 969-35-2730-5

ISBN-13: 978-969-35-2730-8

9789693527308